سرسید شناسی کا دورِ اوّل اور ظفر علی خان

زاہد منیر عامر

ABSTRACT:

This article deals with the tradition of familiarization with Sir Sayyed Ahmad Khan in the course of literary history. Zafar Ali Khan (1873…1956) was a student of Aligarh.

He graduated in 1895. During this period, Maulana Muhammad Ali Johar, Maulana Shaukat Ali and Maulvi Abdulhaq were also studying there. Legends like Maulana Shibli Naumani, Professor T. W. Arnold and Maulana Hali, too were present in Aligarh, at this time. Shibli and Arnold were their teachers as well. Zafar Ali Khan composed Persian poetry in praise of Sir Sayyed Ahmad Khan and recited it in his presence. After listening to it, Sir Sayyed embraced the young poet.

Zafar Ali Khan delivered a speech at Hyderabad Deccan on the 12th death anniversary of Sir Sayyed Ahmad Khan. This lecture was penned down and published in a booklet captioned *A Monograph on Sir Sayyed Ahmad Khan*. Zafar Ali Khan also participated in the different meetings of Muhammadan Educational conference and tried to upgrade Aligarh College to a university. He composed many poems for Sir Sayyed and his educational movement. In this article, some of his rare poems have been discovered and reproduced.

A short comparison of Sir Sayyed and Jamaluddin Afghani is also given and Zafar Ali Khan's booklet on Afghani is also discussed, which is mainly based on Prof. E.G. Brown's Literary History of Persia. In short, this article is a multidimensional study of Sir Sayyed's educational movement and its comparison with Afghani's efforts. It unfolds Zafar Ali Khan's

contribution in the tradition of familiarization with Sir Sayyad Ahmad Khan, in its initial stages.

Keywords: Sir Sayyad Ahmed Khan, Zafar Ali Khan, Aligarh College, AMU Aligarh, Jamaluddin Afghani, E.G. Brown, Sirajuddin Ahmed, Aziz Mirza, Hyderabad, Independence movement.

ابن سینا کے بہ قول دعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو کرۂ سماوی کے ساتھ انسان کا رابطہ قائم کرتا ہے ،مگر بعض لوگوں نے دعا کی اس افادیت کا انکار کیا جن میں معتزلہ سب سے نمایاں ہیں۔ایک زمانے میں جب سرسیّد احمد خان مختلف مذہبی مسائل پر اپنی آرا کا اظہار کر رہے تھے تو انھوں نے دعا پر بھی اظہار خیال کیا۔جس پر ان کے ایک مخلص دوست اور معاصر نواب محسن الملک نے ان سے اختلاف کیا ۔ دونو طرح کی تحریریں سامنے آنے پر سرسیّد کے ایک دورافتادہ عقیدت مند نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ۔بڑے ادب اور احترام کے ساتھ اظہار رائے کرنے والے یہ دورافتادہ عقیدت مند اس وقت ڈیرہ اسمٰعیل خان کی پوسٹل سروس میں خدمات انجام دے رہے تھے ۔انھوں نے سرسیّد اور نواب محسن الملک کے مباحثے کے ضمن میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا:''میں امید کرتا ہوں کہ اگر میرے خیالات غلطی پر ہیں تو حضور یا نواب صاحب ان کی تصحیح کی طرف توجہ فرمائیں گے'' اس نیازمندانہ انداز میں مضمون کا خاتمہ کرنے والے دورافتادہ عقیدت مند کا نام سراج الدین احمد ہے جن کی ڈیرہ اسمٰعیل خان سے ۲۰رنومبر ۱۸۹۵ء کو ارسال کردہ یہ تحریر دورسوم کے تہذیب الاخلاق میں مضمون نمبر ۳۹ کے طور پر شائع ہوئی ۔ [۱]

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس بحث میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی حصہ لیا اور سرسیّد کی تحریروں سے گمان کر کے اپنے ایک اشتہار مجریہ ۲۵رجون ۱۸۹۷ء میں لکھا کہ ''ایک فرقہ نیچریہ مسلمانوں کی گردش ایام سے پیدا ہوگیا ہے یہ لوگ قبولیت دعا سے منکر ہیں'' [۲] سرسیّد نے یہ رائے پڑھی تو اس کا جواب دیا اور وضاحت سے اس کی تردید کرتے ہوئے دعا کو عبادت تسلیم کیا اور لکھا کہ:''خدا مستجاب الدعوات ہے اور وہ ہر ایک بندے کی دعا کو قبول کرتا ہے'' انھوں نے قبولیتِ دعا کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مرزا صاحب موصوف سے خطاب کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ خیال آپ کا صحیح نہیں ہے جن کو آپ نیچریہ فرقہ بتاتے ہیں وہ تو ہر ایک شخص کی دعا کے قبول ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے......آپ کا یہ لکھنا کہ یہ لوگ قبولیت دعا کے منکر ہیں اس لائق ہے کہ اس پر کسی وقت خاص میں آپ دوبارہ غور فرماویں گے'' [۳] سرسید نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی شائع کیا جس میں بہ صراحت ،دعا کو بے فائدہ قرار دینے والوں کو حقیقتِ دعا اور حکمتِ دعا سے ناواقف قرار دیا [۴] زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ سرسید کی اس وضاحت کے باوجود انکارِ دعا کا الزام ایسا ان سے چپکا کہ علامہ اقبال تک اس غلط فہمی کا شکار رہے اور انھوں نے فرمایا کہ'' دو آدمی عجب پیدا ہوئے ہندوستان میں ۔ایک سید احمد خان اور ایک مرزا غلام احمد۔ایک نے دعا سے انکار کر دیا اور ایک نے بات بات پہ دعا کی''مزید یہ کہ ''دعا کے بارے میں سرسید احمد خان اور مرزا صاحب نے انتہا کردی'' اقبال کے خیال میں زندگی ''ایک مسلسل دعا'' ہے اور تاریخ اسلام میں اس نکتے کو ابن خلدون یا ابن

عربی ہی سمجھ سکے [۵]

تاہم یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے اس بحث میں مودبانہ حصہ لیے والے عقیدت مند مولوی سراج الدین احمد خان، مولانا ظفر علی خان کے والد گرامی تھے جنھوں نے صرف نثر ہی میں نہیں نظم میں بھی سرسیّد سے اپنی عقیدت کا والہانہ اظہار کیا اور ان کے تعلیمی مقاصد سے وابستگی اختیار کی۔ وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے۔کم لوگ جانتے ہوں گے کہ مولوی سراج الدین احمد اردو اور فارسی کے ایک نغز گو شاعر تھے وہ کچھ عرصہ پونچھ کے راجہ کے اتالیق رہے پھر ریاست جموں کے محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت اختیار کر لی ۔۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اخبار زمیندار جاری کیا۔ پہلا پرچہ لاہور ہی سے نکالا، موچی دروازے کے اندر چوک نواب صاحب کے ساتھ کی ایک گلی میں دفتر قائم کیا لیکن جلد ہی بعض معاشی دشواریوں کے باعث کرم آباد چلے گئے۔ شاعری میں قدرتِ کلام کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مثنوی گلزار نسیم کو بقدر نصف فارسی میں نظم کر لیا تھا۔ وہ ۹ر نومبر ۱۹۰۹ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔[۶] انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض اجلاسوں میں سرسیّد اور ان کی تحریک کو منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا۔ افسوس کہ ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع ہوا نہ ان کے نثری افکار سامنے آسکے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی نثر میں لکھا۔ اس زمانے میں ان کی بعض اردو کتب شائع بھی ہوئیں جو اب نایاب کے درجے کو پہنچ چکی ہیں۔ مولوی سراج الدین احمد ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں شریک تھے۔ اس اجلاس کے صدر مولوی حشمت اللہ اور استقبالیہ کمیٹی کے سیکریٹری حکیم اجمل خان اور منشی الٰہی بخش تھے۔ اس اجلاس کے انعقاد سے قبل دہلی کے بعض عناصر کی طرف سے اس اجلاس کے انعقاد کی مخالفت کی گئی لیکن اس مخالفت کے علی الرغم ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو اجلاس منعقد ہوا اور اس اجلاس میں مولوی سراج الدین احمد نے برسرِمحفل ایک فارسی نظم موزوں کر کے پڑھی، مولوی صاحب اس وقت محکمہ تار و ڈاک ریاست جموں میں سپرنٹنڈنٹ تھے ان کی یہ نظم سترہ اشعار پر مشتمل ہے، نظم کا مطلع اور آخری شعر درج ذیل ہے ؎

دوش در سر داشتم از حال این و آن جنون
حیرتی می کرد در پہلو دلم را غرق خون [۷]

آخری شعر ہے ؎

یا الٰہی در جہان تا دورِ مہر و ماہ است
باد این اجماع را ہمت فزون، برکت فزون [۸]

سرسیّد اور ان کی تحریک سے اس والہانہ وابستگی ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے بیٹے ظفر علی خان کی تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج کا انتخاب کیا۔ یہاں انھیں جن ہم جولیوں کی صحبت میسر آئی ان میں مولانا حمیدالدین فراہی، مولوی عبدالحق، میر محفوظ علی بدایونی، مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، حسرت موہانی، محمد امین زبیری اور ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے لوگ شامل تھے۔[۹] محمد علی، ظفر علی خان سے ایک سال جونیئر اور شوکت علی ایک سال سینئر تھے، حسرت موہانی بھی جونیئر تھے۔ باقی اصحاب ان کے ہم درس رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرسیّد نے علی گڑھ میں

اطراف و اکناف سے نام ورعلما کو تدریس کے لیے جمع کررکھا تھا جن میں مولانا شبلی نعمانی اور پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جیسے مشرق ومغرب کے علما شامل تھے جن کی بہ یک وقت علی گڑھ میں موجودگی کے باعث علی گڑھ علم و ادب کا چہارم آسماں بنا ہوا تھا خود سرسیّد کے الفاظ میں:

> ''کیا کچھ عزت ہوگی اس زمیں کی جہاں ایسے عالی خیال ،علم دوست،شاعر،مورخ ادیب جمع ہوں گے کیا کچھ عزت ہوگی اس قوم کی جس کے ایسے بزرگ قومی خیال سے اپنا رہنا ایسی جگہ اختیار کریں جہاں رہنے سے قوم کو فائدہ پہنچانا زیادہ تر ممکن ہو، کیسے خوش نصیب ہوں گے وہ نو جوان جن کو ایسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوگی جو باعث افتخار قوم ہیں'' [۱۰]

سرسیّد علی گڑھ کو کس طرح علم و ادب کا گہوارہ بنا دینا چاہتے تھے اور کس طرح گوشے گوشے سے ایسی شخصیات کو بلا کر علی گڑھ میں جمع کر دینا چاہتے تھے اس کا اندازہ ان کے ان جذبات سے بھی ہوتا ہے جو مولانا حالی کی علی گڑھ آمد پر ظاہر ہوئے ۔سرسیّد نے مولانا حالی کی علی گڑھ آمد کے حوالے سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا:

> ''ہم کو خدا سے امید ہے کہ مولانا حالی کا یہ ارادہ پختہ ہوجاوے گا اور وہ اپنی بقیہ زندگی کا حصہ جو خدا کرے گزشتہ حصہ سے دوچند وسہ چند ہوقومی مجمع کی اصلاح میں اور مدرسۃ العلوم کے احاطہ میں دائمی قیام میں بسر کریں گے کیا عجب ہے کہ ہمارے کالج کی زمین کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا ہو کہ وہ ایسے ایسے علم دوست بزرگوں کے پاؤں تلے روندی جاوے۔اس وقت ہم کو ہمارے کالج میں مسٹر آرنلڈ جن کو مولانا آرنلڈ کہنا چاہیے مولانا حالی اور مولانا شبلی کے جمع ہوجانے پر فخر ہے......'' [۱۱]

ظفر علی خان انھی خوش قسمت نوجوانوں میں تھے جنھیں اس ماحول اور اس زمانے میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔مولانا شبلی سے تلمذ سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔اس زمانے میں علی گڑھ میں لجنۃ الادب اور اخوان الصفا جیسی تنظیمیں طلبا کی علمی وادبی تربیت کیا کرتی تھیں ظفر علی خان ان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

ظفر علی خان نے بہ قول خود'' بچپن میں مختلف اسکولوں میں تعلیم پائی ،پانچویں اور چھٹی جماعت تک علی گڑھ میں رہے، مڈل مشن ہائی اسکول وزیر آباد سے کیا، پھر اپنے پھوپا مولوی عبداللہ خان پروفیسر عربی مہندر سنگھ کالج پٹیالہ کے ہاں چلے گئے اور پٹیالہ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا انھی کے مشورے سے علی گڑھ آئے ،ایف اے اور بی اے علی گڑھ سے کیے'' [۱۲] ایف اے کرنے کے بعد انھوں نے ملازمت اختیار کر لی تھی ،محکمہ ڈاک وتار کی اس ملازمت میں ان کا تقرر گلگت ولداخ میں رہا لیکن پھر ترکِ ملازمت کر کے دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور علی گڑھ کالج میں داخل ہوگئے جہاں سے انھوں نے بی اے کا امتحان ۱۸۹۵ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے دیا، اس زمانے میں علی گڑھ کالج کا الحاق الہ آباد یونی ورسٹی سے تھا۔

ایک روایت کے مطابق انھوں نے'' ایف اے کر کے آنے کے بعد ایک نظم بھی لکھی جو افسوس مل نہ سکی'' [۱۳]

لیکن ایک اور نظم کے تین اشعار محفوظ ہیں۔ وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تو بہ قول سالک چند ہی مہینے میں ان کی ادبی صلاحیتوں نے ایسی جلا پائی کہ ہم سبق نوجوانوں کے علاوہ بزرگوں کو بھی احساس ہوگیا کہ یہ نوجوان مبدء فیاض سے خاص ودیعتیں لے کر آیا ہے چنانچہ انھی دنوں اسٹریچی ہال میں ایک جلسہ ہوا ظفرعلی خان نے میز پر کھڑے ہوکر فارسی کی ایک نظم پڑھی جس کے تین اشعار یہ تھے

مسخر کرد نطقم کشورِ جادو بیانی را — بہ دام آورد طبعم صیدِ وحشیِ معانی را
ببین آن سیّدِاحمد کمر از ہمتش محکم — کہ ماہر ہست یکسر چارۂ دردِنہانی را
ریاضِ قوم آب از اشک ہایِ چشمِ او گیرد — فلک چشمِ تو گاہی دیدہ است این باغبانی را

ظفرعلی خان کی اس نظم پر ہرطرف سے تحسین وآفرین کے نعرے بلند ہوئے اور سرسیّد مرحوم نے فرطِ مسرت سے اس نوجوان کو گلے لگالیا[۱۴]

دورانِ طالب علمی سرسیّد کی موجودگی میں کچھ اور جلسوں میں بھی ظفرعلی خان کی شرکت اور نظموں کی پیشکش کا سراغ ملتا ہے مثال کے طور پر مولانا شبلی نعمانی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر ۱۹؍جنوری ۱۸۹۴ء کو جو تہنیتی جلسہ ہوا اس جلسے میں سرسیّد احمد خان اور ان کے فرزند جسٹس سیّدمحمود اور کالج کے دوسرے اساتذہ موجود تھے ،نواب محسن الملک صدارت کررہے تھے ،اس جلسے میں بھی ظفرعلی خان نے اپنے استاد کے حضور منظوم نذرانہءعقیدت پیش کیا۔ اس کی تفصیل ہم اپنے مضمون ''شبلی نعمانی اور ظفرعلی خان'' میں پیش کر چکے ہیں [۱۵]

ایک زمانے میں اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے ظفرعلی خان نے کہا:شبلی جیسے وحیدالعصراور یکتائے زمن لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے،حالی اس زمین پر قدرت کا عطیہ تھے: ہم لوگوں کے لیے جن کی نگاہیں نئی روشنی کی خوگر ہوچکی ہیں اس سے زیادہ فخراس سے زیادہ نازش کامقام کیاہوسکتاہے کہ ہم نے سیّداحمد جیسے مجاہدکا دور دیکھا ہے'' ''سرسیّدکو دیکھا ،معلوم ہوتا تھا دمشق و بغداد کے دریاؤں کی ذہانت، دہلی ولکھنو کے گھرانوں کی شرافت میں ڈھل کرمجسم ہوگئی ہے'' ....[۱۶]

علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد ظفرعلی خان، نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے تھے ۔محسن الملک بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ظفرعلی خا ن کی شخصیت کو متاثر کیا۔ظفرعلی خان، نواب صاحب کی خط کتابت اور ان کی ہدایات کے مطابق انگریزی مضامین کے ترجمے کی خدمت انجام دیتے تھے ۔عملی زندگی میں ظفرعلی خان کے علمی ذوق کی اوّلین تربیت محسن الملک ہی کے ہاں ہوئی۔ ان کے بعض بہترین تراجم کے پس منظر میں بھی محسن الملک سے ان کی وابستگی کا دخل دکھائی دیتا ہے،جس کا اعتراف انھوں نے معرکہ مذہب و سائنس کے انتساب میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ''عالی جناب نواب محسن الملک مہدی علی خاں صاحب مرحوم ومغفور، جن کا نام مسلمانانِ ہند کی علمی تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جاچکا ہے ،سب سے پہلے شخص تھے جن کی تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔اس لیے میں اس کتاب کو جواب نظرِثانی کے بعد حواشی کے ساتھ مکمل ہوکر شائع ہوتی ہے عالی جناب ممدوح کی پاک روح کے ساتھ

نسبت دینے کی عزت حاصل کرتا ہوں'' [۱۷] یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی گڑھ نے ایک نوجوان کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مدد کی اوراس سے متعلقہ لوگوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردارادا کیا۔ سرسیّد نے بھی ایک ابھرتے ہوئے نوجوان کی حیثیت سے ظفر علی خان کے جوہر کو پہچان لیا تھا چنانچہ انھوں نے بروایت محسن الملک کے نام ایک خط میں ان کی نسبت لکھا:

''ظفر علی خان علی گڑھ کے ان ہونہار طلبہ میں سے ہیں جنھیں آئندہ چل کر اپنی قابلیت کے بوتے پر ملک وقوم کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں ۔ میں ان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہاہوں'' [۱۸]

یہ تو سرسیّد کی امیدیں تھیں دوسری طرف ظفر علی خان کے دل میں بھی سرسیّد کی عقیدت ومحبت برابر قائم رہی۔وہ جب حیدر آباد چلے گئے اور انھوں نے یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں اپنے نقوش ثبت کرنا شروع کردیے تو سرسیّد کے بارھویں یوم وفات کی مناسبت سے ۲۷/مارچ ۱۹۰۸ء کو حیدر آباد میں نظام کے فنانشل سیکریٹری مسٹر حیدری کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔اس جلسے سے ظفر علی خان نے انگریزی میں خطاب کیا۔ یہ خطاب چکوٹی ورانہ اینڈ سنز پرنٹرز کی طرف سے کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا [۱۹] ظفر علی خان اس وقت نظام حکومت کے جوڈیشل، پولیٹیکل اور جنرل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ سیکریٹری تھے۔سرسیّد اور ان کے افکار وخدمات پر ظفر علی خان کا نقطہ نظر جاننے کے لیے ظفر علی خان کا یہ خطاب کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔اس خطاب میں ظفر علی خان نے سرسیّد کی شخصیت، ان کے افکار،کمالات اور علی گڑھ کالج کے ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔چونکہ یہ خطاب کتابچے کی صورت میں ظفر علی خان کی ایک تصنیف کے طور پر شائع ہوا اور بعد کے زمانے میں زمیندار میں اس کا اشتہار بھی چھپتا رہا اس لیے ضرور ہے کہ اسے ظفر علی خان نے دیکھ کر ایک تحریر کی صورت دی ہوگی۔ یوں اس میں ظاہر ہونے والے خیالات کی حیثیت محض مجلسی تقریر کی نہیں رہی۔اس کتابچے میں سرسیّد کے بارے میں ظاہر کیے گئے خیالات ایک مسلسل تحریر کی صورت میں ہیں، کسی قسم کی تقسیم یا عناوین کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ہم نے یہاں وہاں سے سرسیّد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ظفر علی خان کے خیالات کو چنا ہے، جنھیں مختلف عناوین میں تقسیم کرکے ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

شخصیت:

ظفر علی خان کے مطابق سرسیّد ایک نمایاں ماہر تعلم،ایک حیران کن سیاستدان، بلا کے خطیب، دانشمند، ایک ماہر معالج،غیر معمولی ماہر آثار قدیمہ، پیدائشی مہندس تھے [۲۰] ان کے سوانحی حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرد میں ترقی کے لامحدود امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں، بات صرف اپنی صلاحیتوں اور ذہنی قابلیتوں کو بروئے کار لانے کی ہوتی ہے ,دورطالب علمی میں وہ کوئی غیر معمولی طالب علم نہیں تھے, عربی میں ان کی استعداد شرح ملا، شرح تہذیب اور مختصرالمعانی تک محدود تھی [۲۱] تاہم ان کی قوتِ مشاہدہ غیر معمولی تھی [۲۲] وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو بروئے کار لائے اور یوں ان تھک محنت اور غیر مختتم مستقل مزاجی کے باعث وہ اپنی مہم میں

کامیاب ہو سکے[۲۳]

جس زمانے میں سرسیّد شعور کو پہنچے مسلمانوں کا زوال و ادبار اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کے بارے میں غالب نے کہا کہ

در روزگار ہا نتواند شمار یافت
خود روزگار ہرچہ درین روزگار یافت [۲۴]

ظفرعلی خان نے ہندوستانی سماج کی عمومی صورت حال ظاہر کرنے کے لیے غالب کی یہ پوری غزل نقل کی ہے ۔ جدید طباعت میں کچھ نقائص رہ گئے ہیں جنھیں حواشی میں درست کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کے ان حالات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے یہاں سے مصر ہجرت کر جانے کا ارادہ کر لیا تھا [۲۵] لیکن بعدازاں انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا اور ہندوستان کے حالات کو بہتر بنانے اور اپنی قوم کو ذلت کے گڑھے سے نکالنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ۔ظفرعلی خان کی رائے میں سرسیّد اپنی عمر کے بہترین صلاحیتوں اور توانائیوں کے دور میں خود کو قومی کاموں کے لیے وقف کر چکے تھے ۔اپنے لیے طے کیے گئے مقاصد کے ساتھ ان کی وابستگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو سرسیّد کی عمر ۴۳ برس تھی ۔ظفرعلی خان کی رائے میں سرسیّد نے مثالی ازدواجی زندگی گزاری تھی اور ان کے تین بچے تھے؛ دو بیٹے اور ایک بیٹی ،دوستوں نے انھیں دوسری شادی کا مشورہ دیا لیکن انھوں نے یہ مشورہ سننے سے بھی انکار کر دیا اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلم نشاۃ ثانیہ کے لیے وقف کیے رکھا[۲۶] مختصراً ظفرعلی خان کی رائے ہے کہ سرسیّد کی روح کی گہرائیوں میں عظمت کے جراثیم چھپے ہوئے تھے [۲۷]

فن:

سرسیّد نے اردو اور فارسی نثر میں اپنی یادگاریں چھوڑیں ان کے کاموں میں قومی وسیاسی خدمات کے علاوہ تاریخی آثار پر تحقیق اور مختلف علاقوں کی تاریخ پر کیے گئے کام اہم ہیں۔بائبل پر تحقیق، امام غزالی کے خطوط ؛آئین اکبری ، تاریخ فیروزشاہی اور آثارالصنادید جیسی کتابیں ان کے اس ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔سرسیّد کی اردو نثر پر، جو مرزا غالب کے بعد اردو کی سہل اور سادہ نثر کا نمونہ ہے، ظفرعلی خان نے اپنی رائے ظاہر کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ :''سرسیّد کی نثر میں مرزا غالب کی نثر کے بالواسطہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں''۔[۲۸] ظفرعلی خان نے ان کے علمی کاموں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بتایا ہے کہ تاریخی آثار پر کیے گئے ان کے کاموں کی بنا پر مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے انھیں برطانیہ اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا اعزازی رکن بنایا اور ان کے کاموں کو قدیم دستاویزات پر کی جانے والی اعلیٰ تحقیق قرار دیا [۲۹] کم لوگوں کو علم ہوگا کہ سرسیّد،شاعر بھی تھے۔ ظفرعلی خان نے سرسیّد کی شاعری کا ایک نمونہ بھی نقل کیا ہے ۔ظفرعلی خان خود حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ تھے اس لیے انھوں نے حیدرآباد اور علی گڑھ کے تعلق کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دہلی دربار ۱۸۷۷ء کے موقع پر سرسیّد نے حیدرآباد اور نظام کے ساتھ اپنے اور مسلم ہندوستان کے تعلق

کااظہار کرتے ہوئے ذیل کے فارسی اشعار کہے جو ظفرعلی خان کی رائے میں اس وقت اور ہمیشہ اس تعلق کی صداقت کا اظہار کرتے رہیں گے ۔

ای که توئی باعثِ اعزاز ما
از تو سزا وار بود نازِ ما
بر سرِ ما ظلِ تو ظلِ ہما
ہست زِ تو فخر و مباہاتِ ما
تختِ نظام است فروزان زِتو
تاج دکن باد درخشان زِتو [۳۰]

کمالات:

برطانوی حکومت نے ۱۸۸۸ء میں سرسیّدکو نائٹ ہڈ کا خطاب دیا، ظفرعلی خان کی رائے ہے کہ یہ خطاب اس سے پہلے کسی ایسے شخص کونہیں ملا جو سرسیّد سے بڑھ کراس خطاب کا حق دار ہو۔اس موقع پر ملکہ برطانیہ کے نمائندے مسٹر کینیڈی نے جو خطاب کیا، ظفرعلی خان نے اس کا انگریزی ترجمہ درج کیا ہے [۳۱] چونکہ مسٹر کینیڈی نے یہ تقریر اردو میں کی تھی اس لیے ہم نے اردو خطاب کے انگریزی ترجمے سے اردو ترجمہ کرنے کے بجائے مسٹر کینیڈی کا اردو خطاب تلاش کیا تو ہمیں خطاب کا عین وہی حصہ جو ظفرعلی خان نے نقل کیا ہے حیات جاوید میں مل گیا۔ مسٹر کینیڈی نے ملکہ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کہا ”سرسیّد کے وسیع تجربے اور ذہانت بھری حب الوطنی سے انگریز اور ہندوستانی عوام دونو ہی نے بہت کچھ سیکھا ہے ان کے دورشباب ہی سے ان کی شخصیت میں علم کی محبت اور وطن کی محبت نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں کردار ادا کیا ہے اور یہ دو چیزیں بہت کم اکٹھی ہوتی ہیں تجدد پسندوں نے انھیں قدامت پرست خیال کیا کیونکہ انھوں نے رسومات مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور قدامت پسندوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ کس طرح اپنے ملک کے باہر کوئی عہدہ یا چیز پاسکیں گے۔انھوں نے اہلِ فرنگ اور اہلِ ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے جو مدددی وہ بہت کم لوگ دے سکے ،سیّدصاحب وسیع ہمدردی دانشمندانہ صلاح ،تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی کی مثال ہیں اور نیز وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے واسطے کبھی کچھ تلاش نہیں کیا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اس لیے ان کے ملک کے لوگ اور ملکہ معظّمہ ان کی عزت کرتے ہیں اور ہم لوگ انھیں محبت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں“ [۳۲]

افکار:

ظفرعلی خان سرسیّدکو” ہندوستان میں مسلم نشاۃ ثانیہ کا نقیب“ [۳۳] سمجھتے ہیں ،ان کے نزدیک سرسیّد نے ”اپنے معاصرین کے سامنے خودانحصاری، قربانی اور قومی وقار کی بے بدل مثال پیش کی“ [۳۴] وہ ایک راہنما، فلسفی اور دوست تھے جنھوں نے قوم کو یہ سبق دیا کہ جب اس میں اچھے حکمران بننے کی صلاحیت نہ رہے تو وہ اچھی رعایا بن

کر دکھائے [۳۵] اس حوالے سے ظفرعلی خان سرسیّد کی کامیابی کے حوالے سے مولانا حالی کا وہ بے مثال تجزیہ پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے سرسیّد کی کامیابی کو تین چیزوں کا نتیجہ بتلایا ہے یہی تین چیزیں ہر صورت میں کامیابی دلانے والی نہیں ہوا کرتیں لیکن سرسیّد کے معاملے میں ان کی ذات اور مزاج نے انھیں دلیلِ کامیابی بنا دیا۔ ظفرعلی خان نے یہ صفات پیش کرتے ہوئے مولانا حالی کا حوالہ نہیں دیا شاید اس لیے کہ اس زمانے میں مولانا حالی کا یہ تجزیہ سرسیّد کے جاننے والوں میں معروف رہا ہوگا۔ ظفرعلی خان نے کہا ہے: سرسیّد کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ تھوڑی سی تعلیم بہت سا تجربہ اور مکمل سچائی جب مل جاتے ہیں تو پھر وہ کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں جو کوئی رستم بھی انجام نہیں دے سکتا [۳۶] انقلاب ستاون میں سرسیّد کے کردار پر شروع ہی سے دو آرا رہی ہیں اور اس کے بعد سرسیّد کے اس مصالحتی کردار پر بھی بہت کچھ حرف زنی ہوئی ہے، ہنوز جس کا سلسلہ جاری ہے جو انھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں فاصلے کم کرنے کے لیے انجام دیا۔ ظفرعلی خان کا کہنا ہے کہ سرسیّد کے نزدیک دونو قوموں میں فاصلے کا سبب باہمی رابطے کا فقدان تھا۔ یہاں انھوں نے سرسیّد کے رسالے اسباب بغاوت ہند کا بھی ذکر کیا ہے جو ظفرعلی خان کے نزدیک ہندوستان کی بنیادی سیاسی ضروریات کا فیصلہ قرار دیے جانے کے قابل ہے [۳۷] اس رسالے میں سرسیّد نے قرار دیا ہے کہ ''بغاوت میں برطانوی حکام اور ہندوستانی عوام باہمی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے'' [۳۸] اسے ایک معذرت خواہانہ رائے قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کا سبب دراصل سرسیّد کے ذہن پر غالب آ جانے والے اس خیال کو قرار دیا جانا چاہیے جس میں وہ عصری سیاسی صورت حال میں مسلمانوں کو انگریزوں کے غیظ وغضب سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ مشرق ومغرب کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے خواہشمند دکھائی دیتے ہیں [۳۹] سرسیّد اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان ربط ضبط بڑھانے کے لیے یہ بات از بس ضروری ہے کہ معیاری انگریزی علوم کو اردو میں ترجمہ کیا جائے [۴۰]۔ سرسیّد لامحدود صلاحیتوں کا غیر مختتم خزانہ رکھتے تھے [۴۱] وہ اپنی اس سوچ میں مکمل طور پر درست تھے کہ پورے ہندوستان کے لیے ایک مشترکہ زبان مشترکہ قومیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے [۴۲] انھوں نے دونو قوموں کے لیے مشترک پلیٹ فارم بنانے کے لیے کوشش کی لیکن ان میں سے ایک نے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دی [۴۳] سرسیّد کے مخالفین کی آرا کے برعکس ظفرعلی خان کی رائے ہے کہ سرسیّد نے اسلام کی آتش افسردہ کو از سرِ نو جلا بخشی ہے'' [۴۴]

تعلیم نسواں:

ظفرعلی خان نے کہا ہے کہ سرسیّد'' یکساں طور پر خواتین کی تعلیم کے بھی ایک پرجوش حامی تھے تاکہ وہ لڑکیوں کو خاص طور پر تعلیم اور نشوونما پاتے دیکھ سکیں'' [۴۵] ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فاضل ناقد یہاں کچھ مبالغے کا شکار ہوئے ہیں۔ حالی نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ ''سرسیّد نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کی اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا یہاں تک کہ لوگوں نے ان کو تعلیم نسواں کا مخالف تصور کیا'' [۴۶] حالی نے اس کا اصل سبب یہ قرار دیا ہے کہ جب سے سرسیّد کو مسلمانوں کی سوشل ریفارم کا خیال پیدا ہوا اس وقت سے اخیر دم تک

وہ فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی خاندانی اور متاہل شخص کس طرح فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہ سکتا ہے؟ حالی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ غدر کے چند روز بعد ان کی والدہ اور بی بی کا انتقال ہو گیا تھا اور دہلی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی تھی۔[۴۷] اور پھر ظفر علی خان نے خود ذرا آگے چل کر یہ کہا ہے کہ سرسیّد کا ''خیال تھا کہ تعلیم کا موجودہ خاندانی نظام جس میں لڑکیاں اپنی ماؤں یا دادیوں نانیوں سے تعلیم حاصل کرتی ہیں معاشرے کی موجودہ صورت حال میں لڑکیوں کے لیے مناسب ہے''[۴۸] یہ بات خود اس امر کی تردید کر رہی ہے کہ وہ خواتین کی تعلیم یا جدید تعلیم یا ویسی ہی تعلیم کے حامی تھے جیسی کہ وہ لڑکوں کے لیے چاہتے تھے۔اس اختلاف کے علی الرغم ظفر علی خان کی اس بات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ سرسیّد اس وقت کے منتظر تھے اور ان کے خیال میں وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا جب خواتین کی اپنے دائرۂ عمل میں آزادی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہو گی [۴۹]

علی گڑھ کالج:

عام خیال یہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں صرف مسلمان ہی تعلیم پاتے تھے۔تاریخی اعتبار سے یہ خیال درست نہیں ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج سے گریجوایشن کرنے والا پہلا طالب علم ایک ہندو تھا جس کا نام ایشوری پرشاد تھا یہ سلسلہ بعد کے زمانے میں بھی جاری رہا آج جس یونی ورسٹی میں تیس ہزار طالب علم تعلیم پا رہے ہیں، جب سرسیّد کا انتقال ہوا تو اس وقت کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ کی کل تعداد ۳۴۳ تھی، ان میں ۵۳ طالب علم غیر مسلم تھے[۵۰] ظفر علی خان نے علی گڑھ کے اس پہلو پر بھی توجہ مبذول کی ہے اور کہا ہے کہ ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے دروازے ہندوؤں مسلمانوں عیسائیوں اور پارسیوں کے لیے یکساں طور پر کھلے ہیں''[۵۱] وسیع المشربی پر مبنی اس ماحول کی مزید تفصیل پیش کرنے کے لیے انھوں نے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی ایک تقریر کا اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ ہنٹر نے کالج فنڈ کمیٹی کی طرف سے پیش کیے جانے والے ایک خطبے کے جواب میں کہا ......علی گڑھ کالج میں ''میں یہ دیکھ کر چونکا کہ شیعہ اور سنی طلبا اکٹھے نماز پڑھ رہے ہیں ،ادارے نے تمام قوموں اور فرقوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ ۲۵۹ طالب علموں میں مجھے ۵۷ ہندو ملے جو تقریباً کل طلبا کی تعداد کا ایک چوتھائی ہیں۔عیسائی اور پارسی لڑکے بھی اس کی حدود میں لبرل تعلیم پاتے ہیں [۵۲]

ظفر علی خان کے خیالات پر مبنی یہ تقریر جس جلسے میں کی گئی وہ جلسہ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن میں منعقد ہوا۔ ظفر علی خان اس سے بہت پہلے بھی سرسیّد اور علی گڑھ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے اس اظہار کی صورت منظوم تھی۔انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پندرھویں اجلاس میں شرکت کی یہ اجلاس مدراس ہائی کورٹ کے جج مسٹر باڈم کی صدارت میں مدراس میں منعقد ہوا۔صوبہ کے گورنر نے بھی شرکت کی۔جسٹس باڈم نے اپنے خطبہ صدارت میں منجملہ دیگر امور کے اس طرف توجہ دلائی کہ ''کوئی تعلیم جو مذہب پر مشتمل نہ ہو کامل نہیں ہو سکتی کیونکہ جس تعلیم سے آدمی کا رویہ درست نہیں ہو سکتا وہ کامل اور سودمند نہیں ہوتی دنیوی تعلیم جو مذہبی تعلیم پر مشتمل نہ ہو وہ محض ایک تادیبی انتظام ہے'' انھوں نے خواتین کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا ''میری نظر

میں یہ نہایت ضروری امر ہے کہ کانفرنس میں لڑکیوں کی تعلیم پر پہلے توجہ دی جائے ہر قوم کی لائف اور ہر شخص کی حیات اور تعلیم میں اناث کے آئین اور ان کی پوزیشن کا بڑا اثر ہوتا ہے آپ کی لڑکیوں کی تعلیم تشفی بخش حالت میں ہے یا نہیں اس پر غور کرنا آپ کا کام ہے‘‘ [۵۳] ان خیالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ارباب علی گڑھ نے سرسیّد کے افکار میں تعلیم نسواں کی نسبت پائی جانے والی کمی کو محسوس کر لیا تھا اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اس کی تلافی کی آواز اٹھائی گئی تھی اس اجلاس میں منظور کی جانے والی قراردادیں بھی خاصی قابل توجہ ہیں بالخصوص ان اصحاب کے زاویہ نظر کی رعایت سے جو ابھی تک اردو کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں ۔ان قراردادوں میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو امتحانات کی سرکاری زبان بنایا جائے اردو اور عربی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ، مذہبی تعلیم کا انتظام مسلمانوں کے مدارس میں قرآن شریف اور ابتدائی مذہبی تعلیم کا لزوم، پنجاب یونی ورسٹی کی مقرر کردہ کتب اردو احاطہ مدراس کے اسکولوں میں داخل کرنے اور مسلم طالبات کے لیے ایک جدید مدرسہ قائم کرنے کے مطالبات کیے گئے تھے ۔ان مباحث اور ان مطالبات سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مزاج و منہج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔روداد کے مطابق ’’اس اجلاس میں مولوی ظفر علی خان بی اے نے ایک پر جوش نظم سنائی‘‘ ۔[۵۴] یہ نظم سرسیّد کے بارے میں ظفر علی خان کے خیالات کا منظوم اظہار ہے جس میں انھوں نے مسلم زوال و ادبار کا نقشہ پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ قوم کی اس صورت حال کو دیکھ کر اس کے دل میں درد اٹھا اور اس نے ٹوٹے ہوئے پروں کو شوقِ پرواز عطا کیا۔اس شخص کے قوم پر بے حد احسانات ہیں جنھیں قوم چکا نہیں سکتی اس کی پکار غازۂ رخسار سحر بنی اور اس کی تحریروں نے اعجاز کی آنکھوں کے لیے سرمے کا کام دیا۔اس نے قوم کو زمانے کے میدان میں فضیلت پانے کا طریقہ بتلایا اور یہ واضح کیا کہ قوم کے لیے علوم و معارف کا حصول کیوں ضروری ہے۔اس نے یہ بات واضح کی کہ اگر ہم ہند میں اپنی بقایا باعزت زندگی چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم حاصل کرنا ہوگی ۔وقت کے ساتھ ساتھ اگر مسلمانوں میں کچھ سیاسی شعور کی بیداری محسوس ہونے لگی ہے تو اس کے پیچھے سرسیّد مرحوم ہی کی کاوشوں کو دخل ہے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جیسے ادارے ملک و قوم کی صورت حال پر غور کے لیے ایسی مجالس ترتیب دے رہے ہیں تو یہ بھی اسی کی دی ہوئی سوچ اور شعور کا نتیجہ ہے ۔پوری نظم درج ذیل ہے :

کیوں نہ ہو آج کی محفل کا نرالا انداز
اس کا ساماں ہے نیا شوق ہے اس کا پرواز
اس کے ہاتھوں پہ حنا بند ہے اس جوش کا رنگ
جس سے اسلام کا عالم میں ہوا تھا آغاز
قالبِ علم میں اس بزم نے پھونکی ہے وہ روح
جس پہ دہلی کو تھا فخر اور تھا بغداد کو ناز
ان کمالات و فضائل کے یہاں چرچے ہیں
اندلس کے جو کسی وقت میں تھے چہرہ طراز

جلوہ آرا وہ حقیقت ہے یہاں آج کے دن
دے گیا جس کی خبر عہدِ گزشتہ کا حجاز
شکر صد شکر کہ ہم خوابِ گراں سے جاگے
للّٰہ الحمد ترقی کا کھلا ہم پر راز
گئے وہ دن کہ تھے ہم مستِ شرابِ غفلت
گئے وہ دن کہ جہالت تھی ہماری دَمساز
گزرا وہ عہد کہ تھے پردہ ور اپنے اوہام
گیا وہ دور کہ ادبار تھا اپنا غمّاز
بختِ خوابیدہ نے اسلامیوں کے کروٹ بدلی
آئی ناگاہ علی گڑھ کی طرف سے آواز
جاگ اے قومِ حزیں نیند یہ آخر کب تک
محوِ آرام ہے تو غیر ہیں صرفِ تگ و تاز
ایک وہ دن تھا کہ شیوہ تھا ترا ناز و غرور
ایک وہ دن ہے کہ آئیں ہے ترا عجز و نیاز
کل تو شہباز تھی اور دوسری قومیں عصفور
آج عصفور ہے تو دوسری قومیں شہباز
گر حکومت ترے ہاتھوں میں نہیں ہے نہ سہی
نہیں زنہار کسی کی یہ عروسِ طنّاز
دولتِ حکمت و دینداری و ہمت لیکن
چھین سکتا نہیں تجھ سے فلکِ عربدہ باز
تھا عجب طرح کا پنہاں اثر ان باتوں میں
اس صدا سے مترشح تھا عجب سوز و گداز
سنتے ہی درد ہر اک شخص کے دل میں اُٹھا
اور بشکستہ پروں کو ہوا شوقِ پرواز
ہم پہ ہیں سیّد مرحوم کے بے حد احساں
جس کا ممکن نہیں انجام یہ ہے وہ آغاز
کس طرح شکر ادا اس کی عنایات کا ہو
وقت ہے مختصر اور اپنی حکایت ہے دراز

اس کی تقریر ہوئی غازۂ رخسارِ سحر
اس کی تحریر بنی سرمۂ چشمِ اعجاز
اس نے سمجھایا ہمیں کسبِ فضائل کا لزوم
اس نے جتلایا ہمیں درکِ معارف کا جواز
اس نے ثابت کیا ہم پر کہ بغیر از تعلیم
نہ کبھی ہند میں ہو گا ہمیں حاصل اعزاز
یہ اسی شخص کا صدقہ ہے کہ اب ہم کچھ کچھ
ہیں سمجھنے لگے دنیا کا نشیب اور فراز
یہ اسی شخص کی کوشش کا اثر ہے کہ یہاں
آج یہ بزمِ مرتب ہے بدیں زینت و ساز
اے خوشابخت کہ مدراس میں اسلام پہ آج
پرچم فضل و ہنر مروحہ جنباں ہے بہ ناز
غلغلہ آج ہے برپا اس اخوت کا یہاں
تھا کبھی جس کے لیے شہرۂ آفاق حجاز
ایسے عالم میں نہ بے جا ہو بہ آہنگِ دُعا
اگر اس طرح میں بے ساختہ ہوں نغمہ طراز
اے خدائے دو جہاں کاشفِ اسرارِ غیوب
جس سے مخفی نہیں انسان کے دل کا کوئی راز
قوت اگلی سی عطا کر تو مسلمانوں کو
اور کر بارِ دگر ان پہ درِ حکمت باز
علم آئینہ اگر ہو تو سکندر ہم ہوں
ہوں مسلمان جو محمود تو ہو علم ایاز [۵۵]

یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی رودادوں میں شامل ہے اور وہاں سے نقل ہوکر ماہنامہ تہذیب کراچی میں شائع ہوئی (شمارہ مارچ ۱۹۹۸ء) تہذیب سے نقل کرکے حال ہی میں سرسیّداحمد خان: منظوم نذرانہء عقیدت نامی مجموعے میں شامل کی گئی لیکن اس مجموعے میں نقل کرتے ہوئے اس نظم کا نام ''سرسیّد کو منظوم خراج تحسین'' کردیا گیا اور ذیلی عنوان کے طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ ''یہ نظم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پندرھویں اجلاس منعقدہ ۱۹۵۱ء میں پڑھی گئی'' [۵۶] نظم کے بیس اشعار درج کیے گئے ہیں جب کہ اصل نظم انتیس اشعار پر مشتمل ہے اس کا عنوان وہ نہیں ہے جو جامعین نے قائم کیا بلکہ کانفرنس کی روداد میں اس کے سرنامے کے طور

پر محض ''نظم مولوی ظفر علی خان بی اے'' لکھا ہے۔ باقی جہاں تک اس کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس میں چھیالیس برس کا فرق آپڑا ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پندرھواں اجلاس ۱۹۰۵ء میں مدراس میں ہوا تھا نہ کہ ۱۹۵۱ء میں جب کہ نحیف و نزار مولانا ظفر علی خان، خطرناک علالت کے ہاتھوں بے حس و حرکت ہو کر مری میں مقیم تھے اور ان کی سواری کو دو قلی آگے سے ہانکتے تھے اور دو پیچھے سے، نظر کمزور، سماعت ثقیل اور زبان خاموش ہو چکی تھی۔ [۵۷]

علی گڑھ کالج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا سرسیّد اس ادارے کو ترقی دینا چاہتے تھے لیکن ان کی حین حیات یہ کالج یونی ورسٹی کے درجے کو نہ پہنچ سکا بعد کے زمانے میں جن لوگوں نے ایک الگ یونی ورسٹی کے قیام کے لیے کوششیں کیں ان میں ظفر علی خان کا نام بہت نمایاں ہے اس لیے کہ انھوں نے نظم اور نثر کے ذریعے مسلسل اس آواز کو زندہ رکھا خاص طور پر ان کا کردار اس لیے بھی اہم ہے کہ وہ ہندوستان کے ایک بڑے اخبار کے مدیر تھے اور اس اخبار کے اوراق پر انھوں نے یونی ورسٹی کی تحریک کو زندہ رکھا۔ مسلسل اس کے حق میں نظمیں اور مضامین شائع کیے۔ ظفر علی خان کیسی یونی ورسٹی چاہتے تھے اس کا ناک نقشہ ذیل کی نظم میں دکھائی دیتا ہے''۔ اسلامی یونی ورسٹی'' کے عنوان سے یہ نظم ان کے ضخیم ترین مجموعے بہارستان میں شامل ہے اس نظم کے بعض حصے، خاص طور پر پہلا حصہ بعض دوسری جگہوں پر الگ نظم کے طور پر بھی نقل ہوا ہے مثال کے طور پر اس حصے کو علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر میں ایک الگ نظم کے طور پر'' فیضان سیّد مرحوم'' کے عنوان سے شائع کیا گیا [۵۸] پوری نظم پچاس اشعار اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ تیرہ، دوسرا سولہ تیسرا بارہ اور چوتھا آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ شاعر کے مطابق یہ یونی ورسٹی محض ایک رسمی تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ملت کی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کا حل پیش کرنے والا مرکز ہوگا۔ تعلیمی ادارہ اپنی نہاد میں اگرچہ ایک چشمے کی طرح ہوتا ہے لیکن یہ ایسا چشمہ ہوگا جس سے دریا جاری ہوتے ہوں۔ وہ اپنے اشعار میں خواجہ حالی کے شعر کو تضمین کرتے ہیں، حالی نے کہا تھا ؎

یہ دارالعلم سدِراہ آسیب زماں ہوگا
اسی دار الشفا میں بختِ پیر اپنا جواں ہوگا [۵۹]

ظفر علی خان گویا تضمین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ دارالعلم سدِ راہِ آسیبِ زماں ہو گا
اسی چشمے سے دیکھوگے کہ اک دریارواں ہوگا [۶۰]

وہ قول جس کی جانب خواجہ الطاف حسین حالی نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ'' کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری''، کوئی دن جاتا ہے کہ زمانہ اس کا عملی نمونہ اس یونی ورسٹی کے روپ میں دیکھے گا ؎

حدیث شاعری جزویست ازپیغمبری سچ ہے
یہ مطلع اس حقیقت کا مصدّق بے گماں ہوگا [۶۱]

اس طرح وہ خواجہ حالی کے خواب کو تعبیر آشنا ہوتے دیکھتے ہیں اور ایک عالم مسرت میں یوں گویا ہوتے ہیں کہ ؎

کہی جو بات برسوں اب سے پہلے خواجہ حالی نے
زمانہ کوئی دن جاتا ہے اس کا ترجماں ہوگا ۶۲

وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس دارالعلم کے قیام سے علی گڑھ کو چار چاند لگ جائیں گے اور اس کے توسط سے ایشیا کے علم وفن کا آسماں منور ہوجائے گا ۔اس ادارے کا قیام مسلمانوں کے لیے رحمت باری کے نزول کا باعث ہوگا اور اس یونی ورسٹی کے قیام سے گویا مسلمانانِ ہند کا نصیب جواں ہوجائے گا اور اسے چارٹر چونکہ قیصر کے ہاتھوں ملے گا اس لیے ظفرعلی خان یہ گمان کرتے ہیں کہ اس طرح مسیحیت ،اسلام کا وہ قرض چکادے گی جو صدیوں سے واجب الادا چلا آتا ہے ۔حریتِ عقل کا خلعت پہن کر علی گڑھ ،علم حقیقی کا پاسبان بن جائے گا اور اس ادارے میں دینی و دنیاوی علوم کی یکجائی ہوگی۔ فقہ اور فلسفہ یوں ہم آہنگ ہوجائیں گے کہ جیسے جسم و جاں میں اتحاد ہو جائے۔ یہی حال مشرقی اور مغربی علوم کا ہوگا جو دو دھاروں کی شکل میں یہاں آکر مل جائیں گے اور یوں علی گڑھ منبع رودِحیاتِ جاوداں بن جائے گا اور اندلس اور بغداد کی روایات یہاں آکر جوان تر ہوجائیں گی..................

مسلمانوں پر بہ حیثیت قوم سرسیّداحمد خان کے احسانات کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ سرسیّد کے احسانات ایسے ہیں جیسے پتھر پر لکیر ہو اور قوم کے دلوں میں ان احسانات کی حیثیت ،لوحِ دل و جاں کے لیے ایک سرمائے کی سی ہے۔ ان کے مطابق آج قوم میں عام بیداری کے جو نشانات دکھائی دے رہے ہیں وہ سب سرسیّد ہی کی عمر بھر کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں ،نسخہ ءملت کے اوراق پریشاں اگر مرتب ہوتے دکھائی دے رہے ہیں تو یہ بھی اسی کی پر ہنر شیرازہ بندی کا نتیجہ ہے ۔رسول ؐآخرزماں سے نسبی تعلق کے زیر اثر اس کی شخصیت میں قوم کا درد مضمر ہے جس سے کام لے کر اس نے خوابیدہ قوم کو بیدار کیا۔ قوم جو ایسی غفلت میں گم تھی کہ جس کے سبب قوموں کی بستیاں ویران ہو جایا کرتی ہیں۔اس کے دیے ہوئے پیغام کے سبب سے قوم کے افراد مضطرب اور بے چین ہوکر قومی مقاصد کے حصول کی جانب گام زن ہوگئے ۔اس کی فکرمندی اور قومی زوال کے غم میں بہائے جانے والے آنسووں نے ریاض قوم کو سیراب کرڈالا آج اگر چہ وہ سوئے فردوس روانہ ہو چکا لیکن اس کے کارنامے مہ وخورشید کی کی مانند فروزاں اور تاباں ہیں ۔اس کی خدمات میں علی گڑھ میں قائم کیا گیا دارالعلم ایک ایسا دبستان ہے جس میں عرب اور عجم کی بلبلیں غزل خواں ہیں ۔ اگر چہ یہ ایک بڑی کامیابی ہے لیکن ہماری ہمتیں اس سے بڑھ کر مقام کی تمنائی ہیں ہم آسمانوں کی چھت کو اپنے قدموں تلے روندنا چاہتے ہیں اور ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ:

بنانا ہے ہمیں ملت کی یونی ورسٹی اس کو
بٹھانا ہے ہمیں اوج ثریا پر ابھی اس کو ۶۳

مسلمانوں پہ جو جو سیّد احمد خان کے احساں ہیں
کَنَقشٍ فِی الحَجَر سرمایۂ لوحِ دل و جاں ہیں
اُسی کی عمر بھر کی کوششوں کا ماحصل سمجھو
اثر جس عام بیداری کے ملّت میں نمایاں ہیں

اُسی کی پُر ہنر شیرازہ بندی کے تصدّق میں
مجزا نسخۂ ملّت کے اوراقِ پریشاں ہیں
حضورِ سرورِ کون و مکاںؐ سے اُس کو ترکے میں
ملا وہ درد ، مضمر قوم کے سب جس میں درماں ہیں
جگایا اُس نے ہم سوتے ہوؤں کو خوابِ غفلت سے
وہ غفلت بستیاں جس سے ہوئیں قوموں کی ویراں ہیں
ہر اک دل میں لگا دی اک نئی ایسی لگن اس نے
کہ آتش زیر پا اس وقت تک اس سے مسلماں ہیں
ریاضِ قومِ کو از بسکہ سینچا اس کے اشکوں نے
بہاریں اس کی رشکِ رونقِ گلزارِ رضواں ہیں
وہ خود تو خلد میں ہے کارنامے اس کے سب لیکن
مہ و خورشید کے مانند تاباں اور درخشاں ہیں
علی گڑھ میں کیا قائم وہ دارالعلم سیّد نے
ثناخواں ہیں پرائے جس کے ، اپنے جس پہ نازاں ہیں
یہ دارالعلم اب بھی گرچہ ہے اسلام کا مرکز
فضائل جس سے پیدا اور معارف جس میں پنہاں ہیں
وہ جاں پرور چمن اس وقت بھی گویا دبستاں ہے
عرب کی اور عجم کی بلبلیں جس میں غزلخواں ہیں
مگر پرواز شہبازِ تمنّا ہے بلند اس سے
ہماری ہمتیں پاکوب سقفِ چرخِ گرداں ہیں
بنانا ہے ہمیں ملّت کی یونیورسٹی اس کو
بٹھانا ہے ہمیں اوجِ ثریّا پر ابھی اس کو

....

نظم کے دوسرے حصے میں ان خوابوں کا ذکر ہے جو علی گڑھ سے متعلق سرسیّد کی آنکھوں نے دیکھے اور جنھیں ان کے، ظفر علی خان جیسے، تلامذہ لے کر آگے بڑھے۔ظفر علی خان کے دائرۂ خیال میں علی گڑھ، علوم مشرق ومغرب کا جامع ہوگا اور یہاں ایک ایسی جامعہ جنم لے گی جو اپنے علمی انقلاب سے اندلس اور بغداد کی یادوں کو فراموش کروادے گی۔ فقہ، فلسفہ اور مذہب یہاں آ کر باہم مل جائیں گے یوں کہ پھر صرف اہل علی گڑھ یا اہل ایشیا ہی کے لیے نہیں یہ ادارہ مسلمانان عالم کے لیے امیدوں کا مرکز بن جائے گا۔اور دنیا بھر سے تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کے لیے علی گڑھ کا

رخ کیا کریں گے:

یہ ''دارالعلم'' سدِّ راہِ آسیبِ زماں ہو گا
اسی چشمے سے دیکھو گے کہ اک دریا رواں ہو گا
حدیثِ ''شاعری جزویست از پیغمبری'' سچ ہے
یہ مطلع اس حقیقت کا مصدّق بے گماں ہو گا
کہی جو بات برسوں اب سے پہلے خواجہ حالی نے
زمانہ کوئی دن جاتا ہے اس کا ترجماں ہو گا
قدومِ میمنت آثار سے اپنے شہنشہ کے
شرف اندوز جس دن کشورِ ہندوستاں ہو گا
علی گڑھ کو لگیں گے چار چاند اور اُن کی کرنوں سے
منوّر ایشیا کے علم و فن کا آسماں ہو گا
عطا فرمائیں گے قیصر وہ شاہی چارٹر اس کو
مسلمانوں کی یونیورسٹی کا جو نشاں ہو گا
مسلمانوں پہ ہو گی نازل اس دن رحمتِ باری
مسلمانانِ عالم کا نصیب اُس دن جواں ہو گا
مسیحیت چکا دے گی تمام اسلام کا قرضہ
وہ قرضہ جانتا جس کو یقیناً اک جہاں ہو گا
سمجھ کر اپنے قیصر کو مثیلِ سایۂ احساں
دلِ احسان پذیر اُس دن رہینِ امتناں ہو گا
ملے گا ہم کو اُس دن خلعتِ حریّتِ عقلی
علی گڑھ علم کا اُس دن حقیقی پاسباں ہو گا
سمیٹیں گے متاعِ دین و دنیا اپنے دامن میں
یہ اسلوبِ مناسب اتحادِ جسم و جاں ہو گا
ہم آغوش آ کے ہوں گے علم اور مذہب علی گڑھ میں
فقیہ و فلسفی ہر اک یہاں کا نکتہ داں ہو گا
علومِ مغربی کا فیض ہو گا اک طرف جاری
علومِ مشرقی کا اک طرف دریا رواں ہو گا

بجھے گی پیاس ہر کشور کے پیاسوں کی یہاں آ کر
علی گڑھ منبعِ رودِ حیاتِ جاوداں ہو گا
مٹا دے گا علی گڑھ اندلس کی یاد کو دل سے
اگر بغداد ہو گا زندہ تو آ کر یہاں ہو گا
یہ مژدہ ہیں وقّارالملک و آغا خاں سنانے کو
کہ ہے فصلِ بہار اسلام کے گلشن میں آنے کو

اس سے اگلے حصہ نظم میں شاعر قرآن اور حدیث کے حوالے دے کر قوم کو علی گڑھ میں یونی ورسٹی کے قیام کے لیے مطلوب رقم فراہم کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد یاد دلایا جاتا ہے کہ تم اس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اللہ کی راہ میں وہ خرچ نہ کرو جو تمھیں سب سے زیادہ عزیز ہے(۹۲:۳)۔ شاعری کی دنیا میں آسمان کو کبھی فلک اور کبھی فلک پیر کہہ کر انسانوں کی تمناؤں کا دشمن بتایا جاتا ہے یہاں شاعر کہتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کی گردش کے بعد آسمان، روشِ دشمنی ترک کرتے ہوئے راہ پر آ گیا ہے اور گرد و پیش کے حالات اب قومی مقاصد کے حصول سے موافق ہیں۔ قومی راہ نما قوم کے مقاصد اور ضروریات سے آگاہ ہیں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں چنانچہ اب قوم کو چاہیے کہ ان کی پکار پر لبیک کہے۔ جب قوم کے اکابر بیدار ہوں تو قوم کو بھی خوابِ غفلت سے جاگ جانا چاہیے۔ حدیث نبویؐ سے استشہاد کرتے ہوئے الفقر فخری کا مشہور قول نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ فقر میرا فخر ہے۔ یعنی اس حصے میں شاعر نے یونی ورسٹی کے قیام کے لیے نواب وقارالملک اور سر آغا خان کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے قوم کو اس جانب متوجہ کیا ہے کہ جب وقارالملک اور آغا خان ایسے لوگ اپنی عز و شان کے علی الرغم کشکول گدائی ہاتھ میں لے کر تمھارے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں اور تمھیں بتایا جا رہا ہے کہ فقط دس لاکھ روپے میں یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو پھر قوم کو کس بات کا انتظار ہے؟ قوم کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر اس قومی ضرورت کو فی الفور پورا کر دے اور ایسے معزز راہ نمایان قوم کی جانب سے کی گئی اپیل کی لاج رکھے۔

مسلمانو! بس اُٹھ بیٹھو کہ وقتِ امتحاں آیا
ہماری راہ پہ اک عمر کے بعد آسماں آیا
کرو گے اس سے بڑھ کر فخر تم کس بات پر یارو
کہ خود چل کر تمھارے گھر شہِ ہندوستاں آیا
اُلٹ جائے گی قسمت ہی نہ اب بھی گوہرِ مقصود
تمھارے ہاتھ اگر اے معشرِ اسلامیاں آیا
سمجھ لو لَنْ تَنَالُوا البِرَّ حَتیٰ تُنفِقُوا کو تم
کہ یہ ارشاد ہے قرآں کے اندر بے گماں آیا

خدا کا شکر ہے ملّت کے جو مخدوم ہیں ان کو
خیالِ دست گیریِ گروہِ بے کساں آیا
بنے قومی گدا اور لے کے کاسہ ہاتھ میں نکلے
وہ کاسہ ہاتھ جس سے حاصلِ صد بحروکاں آیا
نہ روکا اس سے ہرگز ان کو آسائش نے دولت کی
نہ ان کو مطلقاً مانع خیالِ عزّو شاں آیا
لیے کشکول آغا خان کو جب دیکھا گدائی کا
نظر الفقر فخری کا ہمیں دلکش سماں آیا
پھری تصویر ایثار اور فیّاضی کی آنکھوں میں
زباں پر جب ہمارے نامِ سلطانِ جہاں آیا
جب اعیان و اکابر کی یہ بیداری کی حالت ہے
رہے گی قوم محوِ لذّتِ خوابِ گراں آیا
پیادے اُٹھ کے دوڑیں ساتھ ساتھ اشتر سواروں کے
کہ منزل کے قریب الحمدللہ کارواں آیا
فقط دس لاکھ میں مقصد کی اب تکمیل ہوتی ہے
سمجھ سکتے نہیں ہم کس لیے پھر ڈھیل ہوتی ہے

نظم کا آخری حصہ بھی اسی تشویق کا مظہر ہے۔ ظفرعلی خان کے نزدیک ساقی کی چشم مست اگر ہشیار ہوجائے تو یہ مسئلہ چٹکی بجانے میں حل ہوسکتا ہے۔ وہ تاجداردکن نواب آصف جاہ سادس کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں اوراسے قوم کا سردارقرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آپ کی نگاہِ التفات ادھر ہوجائے تو یہ عقدۂ دشوار پل بھر میں حل ہوسکتا ہے۔ وہ تاجداردکن کی فراخ حوصلگی اور فراخ دستی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب علی گڑھ آپ کے دامن فیض سے وابستہ ہے تو پھر اسے ہر بار کاسہ گدائی کیوں اٹھانا پڑتا ہے؟ یہاں ان کا قلم قصیدے کی روش اختیار کرلیتا ہے اور مدح کے بعد معاً حسن طلب کا اظہار کرتا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ میرمحبوب علی خان تک جیسے ہی یہ پکار پہنچے گی تو ان کا دریائے سخاوت فوراً جوش میں آجائے گا اور بلا دقت مسلمانوں کا بیرا پار ہو جائے گا اوراس طرح قوم کی مشکلات آسان ہوجائیں گی اورعلی گڑھ علم کا خورشیدنورافشاں بن جائے گا ۔

یقیں ہے پل میں حل یہ عقدۂ دشوار ہو جائے
ذرا ساقی کی چشمِ مست اگر ہشیار ہو جائے
کرے گی قوم مل کر عرض آصف جاہِ سادس سے
ادھر بھی اک نظر اے قوم کے سردار ہو جائے

بنایا خاک کو ہے کیمیا تیری نگاہوں نے
خذف جس کے اثر سے گوہرِ شہوار ہو جائے
سرور انگیز تیرا بادۂ ایثار و احساں ہے
پلا اتنا کہ محفل مست اور سر شار ہو جائے
ترا وابستۂ دامانِ دولت جب علی گڑھ ہے
یہ استمداد کو طیار کیوں ہر بار ہو جائے
اگر جُنبش میں آجائے کفِ گوہر فشاں تیری
مسلمانوں کی یونیورسٹی تیار ہو جائے
اگر یہ عرض پہنچے میر محبوب علی خاں تک
بلا دِقّت مسلمانوں کا بیڑا پار ہو جائے
خدا چاہے تو ہوں گی مشکلیں سب قوم کی آساں
علی گڑھ علم کا بن جائے گا خورشیدِ نورافشاں ۶۴ے

یہاں رُک کر اگر اس دن کی یادتازہ کی جائے جب علی گڑھ کالج کا سنگ بنیادرکھا جارہا تھا تو اس وقت جو خواب دیکھے گئے تھے وہ اس نظم میں پیش کیے گئے خیالات وعزائم سے مختلف نہیں تھے۔علی گڑھ کے تعلیمی ادارے کے تاسیسی جلسے کی روداد سرسیّد کے اولین سوانح نگار کرنل گراہم بیل نے سرسیّد کی سوانح میں پیش کی ہے،ذیل میں اس موقع پر ظاہر کیے جانے والے خیالات کا ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے:

> From the seed which we sow today there may spring up a mighty tree, whose branches, like those of the banyan of the soil, shall in their turn strike firm roots into the earth, and themselves send forth new and vigorous saplings ; that this college may expand into a university, whose sons shall go forth throughout the length and breadth of the land to preach the gospel of free inquiry, of large-hearted toleration, and of pure morality. ے 65

سرسیّد اور ان کے ہم نواؤں کا یہ خواب بالآخر ۱۹۲۰ء میں تعبیر آشنا ہوا اور علی گڑھ کالج ترقی پا کر یونی ورسٹی بن گیا۔ یہ ظفر علی خان اور ان کے ہم نواؤں کے لیے مسرت وانبساط کا ایک بڑا مرحلہ تھا۔علی گڑھ کالج کے یونی ورسٹی بن جانے کے بعد بھی ظفر علی خان، سرسیّد کے اس ادارے کے ساتھ اپنا تعلق خاطر برقرار رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے یہاں آ کر متعدد جلسوں میں تقریریں کی اور تحریک آزادی کے مختلف مراحل میں یہاں آ کر نہ صرف سرسیّد کی یادکو تازہ رکھا بلکہ قافلہ حریت کی حدی خوانی کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری

کے بعد وہ اس قرارداد کے حق میں فضا ہموار کرنے کے لیے علی گڑھ پہنچے اور انھوں نے یہاں ایک پرجوش تقریر کی۔ اس جلسے میں آواز دوست کے مصنف مختار مسعود بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے شریک تھے۔ مختار مسعود کے مطابق وہ جذبے سے مغلوب ہوکر بولے اور سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئے ان کی تقریر کا موضوع وہ اساسی اور سیاسی قرارداد تھی جسے چند ماہ پہلے مسلم لیگ نے لاہور کے منٹو پارک میں منظور کیا تھا اس تقریر میں قائداعظم کا ذکر کئی بار آیا تقریر کے دوران ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حالی اور قائداعظم کے درمیانی وقفے کا نام ظفر علی خان ہے'' [۶۶]

صرف یہی نہیں شاعری کی دنیا میں بھی سرسیّد اور ان کی تحریک سے ظفر علی خان کا تعلق قائم رہا اور انھوں نے تحریک آزادی میں علی گڑھ کے نوجوانوں کو ہراول دستے کی حیثیت سے دیکھا۔

ظفر علی خان کو بہ قول شورش کاشمیری، علی گڑھ سے عمر بھر انس رہا پنجاب کے قصبات میں کنجاہ مولانا غنیمت کی وجہ سے مشہور ہے اکثر لوگ اس کے نسوانی حسن کی عموماً تعریف کرتے ہیں، مولانا وہاں تشریف لے گئے تو یار لوگوں نے بداہتہً شعر کہنے پر اصرار کیا۔ نو شعر کہے مطلع کے مضمون سے گریز کرتے اور علی گڑھ سے اپنے عشق کی داستان کہتے ہیں [۶۷]:

یہ حسن و عشق کا گھر ہے اسے کنجاہ کہتے ہیں
مرے ہر جرم کا آ کر یہاں کفارہ ہوتا ہے
مرا بھی ایک شاہد ہے علی گڑھ نام ہے جس کا
مرا دل اس کی چشم مست کا گہوارہ ہوتا ہے [۶۸]

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں

سواد اعظم اسلام کی نگاہِ امید
جمی ہوئی ہے علی گڑھ کے نوجوانوں پر [۶۹]

ظفر علی خان کو صرف سرسیّد ہی سے نہیں بلکہ ان کے خانوادے سے بھی عقیدت رہی۔ جس کا ثبوت سیّد محمود (۲۴ر مئی ۱۸۵۰ء ......۸ر مئی ۱۹۰۳ء) کی وفات پر لکھا گیا ان کا مرثیہ ہے۔ سیّد محمود، سرسیّد کے دوسرے فرزند تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مرادآباد، دہلی گڑھ اور بنارس میں حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ یونی ورسٹی سے میٹرک کے بعد ۱۸۶۹ء میں لنکنز انّ میں چلے گئے جہاں انھوں نے قانون کا امتحان پاس کیا اور لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھیں۔ وہ ۱۸۸۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے قائم مقام جج بنے، وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنھیں یہ منصب ملا۔ انھیں صوبہ سرحد اور اودھ کی لجسلیٹو کونسلوں کا رکن بھی نامزد کیا گیا۔ انھوں نے علی گڑھ کالج کے قیام میں اپنے والد کی مدد کی۔ *A History of English Education in India* اور قانون شہادت مجریہ ۱۸۷۲ء کا اردو ترجمہ نیز ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک کیے گئے تین سو عدالتی فیصلے ان کی یادگار تحریریں ہیں۔ وہ ۸ر مئی ۱۹۰۳ء کو سیتاپور میں راہی ملک عدم ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی مسجد کے زیر سایہ اپنے والد کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔ ظفر علی خان نے ان کی وفات پر جو مرثیہ کہا اس سے خانوادۂ سرسیّد کے ساتھ ان کی وابستگی اور سرسیّد کی خدمات کے حوالے

سے ان کے اعتراف کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ مرثیہ قصیدے کی طرح تشبیب گریز مدح اور خاتمہ کے حصوں پر مشتمل ہے ۔ مرثیے کا پہلا بند تشبیب یا تمہید پر مشتمل ہے ۔گیارہ اشعار کے اس بند کا گیارھواں شعر گریز کرتے ہوئے سیّد محمود کے سدھارنے کی اطلاع دیتا ہے ۔ دوسرا بند بھی گیارہ اشعار پر مشتمل ہے جس کا آغاز سرسیّد مرحوم کا فرزند ہونے کے تذکرے سے ہوتا ہے اوراس بند میں سیّد محمود کی صفات بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق مرحوم کو قوم کے لیے سرمایہ نازش اور گنجینہ صد فضل و ہنر قرار دیا گیا ہے اوراسے قانون کے اسرار وغوامض کا شناسا اور اپنوں اور غیروں میں یکساں مقبول بتایا گیا ہے ۔ وہ ایک باکمال شخصیت کا حامل ہونے کے باوصف احساسِ کمالات کے زعم سے پاک تھا،سادات میں سے ہونے کے باعث مرحوم کو رسول اللہ ؐ کا نواسہ قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اسے غنا کی صفت ورثہ میں ملی تھی۔اس کا ماتم صرف اس کے وطن مالوف ہی میں نہیں کیا جارہا بلکہ دکن بھی اس کے لیے سوگوار ہے جہاں پہلے پہل اس کے کمالات کا اظہار ہوا تھا۔اس بند کا اختتام جس شعر پر ہوتا ہے، بہارستان کے مختلف نسخوں میں اس کا متن مختلف ہے ۔ کلیات مولانا ظفر علی خان میں یہ شعر بدین صورت درج ہے ۔

محمود کے مرنے کی ہے دشوار تلافی
ہے صبر کا یہ صدمہ، لب جاں کا منافی ۷۰

بہارستان کا وہ بلا تاریخ نسخہ جو مکتبہ کاروان لاہور سے شائع ہوا تھا اور جس پر' سرآغاز' کے کلمات اصغر حسین خان صاحب نظیر لدھیانوی کے ہیں، اس میں بھی شعر کی یہی صورت ہے ، ۷۱ اس لیے کہ کلیات مولانا ظفر علی خان کی اساس اسی نسخے پر ہے ۔بہارستان کی وہ اشاعت جسے پیش نظر رکھ کر نظیر لدھیانوی صاحب مرحوم نے مکتبہ کاروان کا نسخہ مرتب کیا تھا ۱۹۳۷ء میں اردو اکیڈیمی پنجاب سے شائع ہوئی تھی اس میں بھی...... ہے صبر کا یہ صدمہ لب جاں کا منافی...... ۷۲ درج ہے ،اگراس سے بھی پیچھے جایا جائے تو فقط وہ نسخہ بچتا ہے جو دارالاشاعت بہارستان گجرات سے شائع ہوا تھا چونکہ یہ نسخہ مغلوط تھا اس لیے مولانا ظفر علی خان نے اس کی تمام کاپیاں دریائے راوی کے سپرد کردی تھیں ہمیں اس نایاب نسخے کا متن دیکھنے کا موقع ملا ہے ہم نے اس سے موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا متن سب سے زیادہ مغشوش ہے یعنی ......ہے صبر کا یہ صدمہ لب جاں کاہ منافی......۷۳ ہماری رائے میں مصرعے کی شکل ''ہے صبر کے یہ صدمہ جانکاہ منافی''......ہونی چاہیے تھی لیکن مطبوعہ متون ہی کے الفاظ سے درست مصرع دریافت کیا جائے تو صورت کچھ یوں بنتی ہے ۔

ع ہے صبر کا ، یہ صدمہ ٔجاں کاہ منافی

آخری بند غالب کی اس زمین میں ہے،جس میں اس نے زین العابدین خان عارف کا مرثیہ لکھا تھا یعنی ۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں ، اب رہو تنہا کوئی دن اور ۷۴

ظفر علی خان اس بند کا آغاز اس طرح کرتے ہیں ؛

خون روئے گا یہ دیدۂ گریاں کوئی دن اور — رکھے گی تری یاد پریشاں کوئی دن اور

مٹی میں تجھے سونپ کے پہلوئے پدر میں — جاں کھوئیں گے ہم سوختہ ساماں کوئی دن اور
کچھ گزری ہے اور ہوگی بسر کچھ ترے غم میں — اس مرحلے کے ہم بھی ہیں مہماں کوئی دن اور
چپ چاپ پڑے سوئیں گے مرقد میں ہمیشہ — کرلیں ترے ماتم میں ہم افغاں کوئی دن اور
اس سن میں تری موت قیامت سے نہیں کم — رکھنا تجھے روشن تھا یہ زنداں کوئی دن اور
نوخاستہ بیٹے کو دیا داغِ یتیمی — اس سے تو نہ تھا توڑنا پیماں کوئی دن اور
تو قوم کی خدمت میں رہا باپ کا پیرو — یادآئیں گے ہم کو ترے احساں کوئی دن اور

مرحوم کو دے خلد ہمیں خالق اکبر
نعم البدلِ سیّد محمود عطا کر ۵۷

غالب کی زمین میں اور وہ بھی مرثیے ہی کے اشعار کہنا مولانا ظفرعلی خان جیسے باہمت ہی سے ممکن تھا۔زین العابدین خان عارف،غالب سے دوہرا تعلق رکھتے تھے۔وہ غالب کی بیوی کے بھانجے اور اور غالب کے منہ بولے بیٹے تھے ۔۱۸۱۷ء سے ۱۸۵۲ء تک کی حیات میں کل پینتیس چھتیس برس کی عمر بنتی ہے ۔ غالب سے عارف کے تعلق خاطر کا اندازہ اس قطعے سے بھی کیا جاسکتا ہے جو اس مرثیے کے علاوہ بزبان فارسی کہا گیا تھا۔

بہ یقین دان کہ غیر من نبود
گر نظیر تو درگمانِ منست ۵۸

ان اشعار میں غالب کی زمین ہی نہیں اس کے مضامین بھی اپنا عکس دکھا رہے ہیں ۔مطلع میں غالب کے مطلع کا عکس ہے ۔دوسرے شعر میں غالب کے دوسرے شعر کا۔اس سن میں تری موت قیامت سے نہیں کم ......الخ میں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں + مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور'' کا عکس پایا جاتا ہے ۔کم سن بیٹے کو داغِ یتیمی دینے کے مضمون نے غالب کے اشعار سے مرثیے کے مضمون کی نسبت کو محکم تر کردیا ہے ۔یہ اشارہ سیّد محمود کے کم سن بیٹے راس مسعود(۱۵رفروری ۱۸۸۹ء......۳۰رجولائی ۱۹۳۷ء) کی طرف ہے جو باپ کی وفات کے وقت عمر کی محض چودھویں منزل میں تھے ۔گویا کہا جا رہا ہو:''بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور''۔ اس حصے کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کے دو اشعار میں ذاتی کرب کا لہجہ بھی در آیا ہے جو مولانا ظفرعلی خان کے اشعار میں ایک نایاب بات ہے ۔'' کچھ گزری ہے اور ہوگی بسر کچھ ترے غم میں'' میں جہاں غالب کے مقطعے کا مضمون جھلک دکھا رہا ہے وہاں یہ بات کہتے ہی ان کے دراِحساس پر اس خیال کی دستک سنائی دیتی ہے کہ......''اس مرحلے کے ہم بھی ہیں مہماں کوئی دن اور''۔جانے والے کا غم مناتے ہوئے زندگی کی یہ سفاک حقیقت ابھر کر ان کے سامنے آجاتی ہے کہ مرنے والوں کو سپردخاک کرنے والوں کو بھی ایک دن خاک کا رزق ہونا پڑتا ہے ۔چنانچہ ان کے ہاں ایک غمیں لہجہ ابھرتا ہے اور وہ اپنے اظہارِ غم پر اظہارِ حیرت کرتے ہیں اور ان پر مرقد کی اُداسی کا خیال غالب آجاتا ہے ۔غالب نے کہا تھا کہ دوسروں کے مرنے کا وہ غم کرے جو خود نہ مرے ظفرعلی خان کہتے ہیں ۔

چپ چاپ پڑے سوئیں گے مرقد میں ہمیشہ
کرلیں ترے ماتم میں ہم افغاں کوئی دن اور

کاش شاعری کی مجبوری آہ وفغاں کوافغان بننے سے بچالیتی ۔ظفرعلی خان کی قدرت کلام میں کلام نہیں،اس کے باوصف غالب اگر یہاں بھی غالب رہاہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کا صدمہ ذاتی تھااور ظفرعلی خان کا قومی ۔دل چسپ بات یہ کہ بہارستان کا وہ نسخہ جو دارالاشاعت بہارستان کے مغلوط نسخے کو دریا برد کیے جانے کے بعد تصحیحات کے ساتھ شائع ہوا،اس میں سیّدمحمود کے اس مرثیے کا ایک حصہ محمد اکبرخان کے مرثیے میں جا پڑاہے ۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مولانا ظفرعلی خان کاایک حقیقی بھائی چھبیس برس کی عمر میں ملکِ عدم کو سدھار گیا تھا ۔وہ بڑا قابل شاعر ونثر نگاراور اپنے برادر بزرگ کے ادبی کاموں میں ان کا معاون تھا ۔ظفرعلی خان نے سیر ظلمات کے دیباچے میں اسے ’’لائق اور ہونہارنوجوان‘‘ قرار دیاہے اور سیر ظلمات کی تدوین و ترتیب اور ترجمہ میں بیش بہامدد دینے اوراس کے اتمام میں معتد بہ حصہ‘‘ لینے پر اس کا شکریہ ادا کیاہے۔انھوں نے اپنے اس برادرِخورد کا مرثیہ بعنوان’’ محمد اکبرخان مرحوم المتوفی ۱۳۲۳ھ‘‘ لکھا تھا[۷۷]۔ بہارستان کے مذکورہ نسخے میں اس مرثیے کے پہلے بند کے بعد دوسرااور تیسرا بندسیّدمحمود کے مرثیے کا جاملاہے اوراس کے بعد سیّدمحمود کے مرثیے کا الگ عنوان قائم کرکے سیّدمحمود کے مرثیے کا فقط پہلا بند لکھ دیا گیاہے۔ بہارستان کا یہ نسخہ بڑے اہتمام سے عمدہ جلی کتابت کے ساتھ اچھے کاغذ پر شائع کیا گیا تھا ۔۸۲۸صفحات پر مشتمل اس نسخے کے صفحہ ۷۹۹ سے ۸۰۲ تک محمد اکبرخان کا مرثیہ ہے اوراور صفحہ ۸۰۳ پر’’ مرثیہ آنریبل سیّدمحمودمرحوم ومغفور‘‘ درج ہے جوایک ہی صفحے میں ختم ہو گیاہے ۔شکرہے کہ بعد میں نظیرلدھیانوی صاحب کی مرتبہ بہارستان میں یہ غلطی رفع کردی گئی تاہم اس اشاعت میں ایک نئی غلطی سرزد ہوگئی۔وہ یہ کہ نظم کے آخر میں تاریخ تخلیق جولائی ۱۹۳۰ء درج کردی گئی ہے [۷۸] بعد میں شائع ہونے والے بہارستان کے نسخے حتی کہ کلیات ظفرعلی خان میں چونکہ کسی قسم کی تحقیق یا تدوین کو راہ پانے کی اجازت نہیں دی گئی اس لیے اس غلطی کی پیروی کی گئی ہے [۷۹] ہم اس تاریخ تخلیق کو دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غرق ہوتے رہے کہ سیّدمحمود کا انتقال ۸رمئی ۱۹۰۳ء کو ہوا۔کیا ان کا مرثیہ ان کے انتقال کے بعد ستائیس برس تک تاخیر کا شکار ہوتارہا......؟ اس تاریخ پر عدم اطمینان کے باعث ہم نے کلیات اور جدید بہارستان کے ماخذ درآخذ کا سفر کیا تو عقدہ کھل گیا ۔ بہارستان کے مولانا ظفرعلی خان کی زندگی میں شائع ہونے والے دونو نسخوں میں درست تاریخ مل گئی ۔ وہ نسخہ جسے مغلوط ہونے کی بناپر دریائے راوی کی لہروں کی نذرکردیا گیا اس میں جہاں دوسری بے شمار غلطیاں تھیں وہاں یہ تاریخ بالکل درست یعنی جولائی ۱۹۰۳ء درج تھی [۸۰] اسی طرح اردو اکیڈیمی لاہور سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہونے والے نسخے میں بھی درست تاریخ یعنی جولائی ۱۹۰۳ء درج ہے [۸۱] جو سیّدمحمود مرحوم کے انتقال کے قریب کا زمانہ ہے ۔نظیرصاحب والے نسخے میں جوغلطی ہوئی بعد میں اسی کو دہرایاجاتارہا۔

سرسیّداور علی گڑھ سے ظفرعلی خان کا تعلق یہاں تک محدودنہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی ان کے ہاں اس کا

اظہار ہوتا رہا۔ ۱۹۳۴ء کی ایک نظم میں علی گڑھ کے نوجوانوں کے اس فیصلے کی نشان دہی کرتے ہیں جو وہ مادرِ وطن کی آزادی کے لیے کر چکے تھے۔ یہ نظم بھی جہاں سرسیّد تحریک سے ان کی جذباتی اور سیاسی وابستگی کی ایک مظہر ہے وہاں علی گڑھ یونی ورسٹی کے ساتھ مسلسل انسلاک کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''علی گڑھ کے نوجوانوں کا فیصلہ'' اور تخلیق کا زمان و مکان ہے: لاہور ۹ ستمبر ۱۹۳۴ء

اُدھر ہے جبر کی آن اور اِدھر ہے صبر کی شان
مقابلہ ہے توانا سے نا توانوں کا
اُدھر ہے قائدِ افواجِ ہند کی للکار
ادھر سکوت صف آرا ہے بے زبانوں کا
اُدھر غرورِ حکومت کے طنطنہ کی نمود
اِدھر مظاہرہ دس بیس نیم جانوں کا
سراغ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کونسلوں میں ہم
وطن کی عزتِ گم گشتہ کے نشانوں کا
نہ کٹ سکیں اگر اُن سے ہماری زنجیریں
تو مسجدوں میں عبث شور ہے اذانوں کا
نہیں رہی وہ تڑپ دل میں جو الٹتی تھی
پلوں میں تخت جہاں کے خدائگانوں کا
کبھی چلائے تھے بیڑے جنھوں نے خشکی پر
ہے عزم آج کہاں اُن جہازرانوں کو
ہزار حیف کہ مٹی میں مل رہا ہے وقار
حریمِ کعبہ کی حرمت کے پاسبانوں کا
ہمارے بسنے کے قابل نہیں رہا یہ وطن
یہ فیصلہ ہے علی گڑھ کے نوجوانوں کا [۸۲]

ظفر علی خان کی شخصیت اپنی تشکیل کے مختلف مراحل سے گزری اور ان مراحل میں وہ مختلف شخصیوں سے متاثر رہے، ایسی کچھ شخصیات کا پہلے ذکر ہوا۔ ابتدا میں جیسا کہ فطری امر تھا وہ اپنے والد محترم سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی طرح مضمون نگاری اور شعر و شاعری اور ڈاکخانے کی ملازمت۔ تاہم ان کی باغیانہ طبیعت کو ملازمت سے نسبت نہیں تھی یوں بھی ملازمت کی خاطر انھیں تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا تھا، مزاج کی عدم موافقت اس پر مستزاد تھی چنانچہ ملازمت کا قلادہ گلے سے اتار کر ایک بار پھر تعلیمی سلسلہ بحال کیا اور علی گڑھ پہنچ گئے [۸۳]۔ وہ علی گڑھ میں سرسیّد کی شخصیت سے متاثر ہوئے، ایسا ہونا بھی فطری تھا، اگر وہ علی گڑھ میں رہ کر سرسیّد سے متاثر نہ ہوتے تو تعجب کی

بات تھی۔ وہ مزاحمت کی بجائے حکومت وقت کے ساتھ مفاہمت کی روش پر عمل کرنے اور اپنی توجہ تعلیم پر مرکوز رکھنے والے طالب علم ثابت ہوتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی علمیت بھی ان پر اثر انداز ہوئی جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ نوجوانوں میں انھیں عزیز مرزا(۱۸۶۴ء......۱۹۱۲ء) نے متاثر کیا۔ عزیز مرزا کو جاننے والے اب تو کم ہی ہوں گے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد پڑنے پر جو طالب علم اوّل اول اس کے دامن سے وابستہ ہوئے دس سالہ عزیز مرزا بھی ان میں شامل تھے۔ اس اعتبار سے وہ ظفر علی خان کے سینئرز میں شامل ہوتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف کالج کی زندگی میں محکم نقوش چھوڑے بلکہ یہاں سے فارغ ہونے کے فوراً بعد وہ حیدرآباد چلے گئے جہاں ترقی کرتے کرتے وہ ڈپٹی کمشنر، ہوم سیکریٹری اور، عدالت عالیہ حیدرآباد کے جج ایسے اہم مناصب تک پہنچے۔ وہ شمالی ہند میں پہلے پہلے مسلمان تھے جس نے بی اے کے امتحان میں ڈبل آنرز کا اعزاز حاصل کیا [۸۴] انھوں نے اپنے تعلیمی ادارے کو ہر مرحلے پر یاد رکھا ان کی کوششوں سے ہندوستان کے مختلف خطوں کے نوجوان علی گڑھ میں داخل ہوئے اور صدہا مسلمانوں کو ملازمتیں ملیں۔ یہ عزیز مرزا ہی تھے جنھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ لکھنو میں ۱۹۰۹ء میں مسلم یونی ورسٹی کے قیام کا رزولیوشن پیش کیا۔[۸۵]

اب انھیں جاننے کے لیے ان کی کتابیں، خیالات عزیز اور سلاطین بہمنیہ کے زمانے کے ایک با کردار وزیر خواجہ محمود گاواں کی سوانح سیرۃ المحمود ہی باقی رہ گئی ہیں۔ یا پھر ان کے کیے ہوئے تراجم دیکھے جا سکتے ہیں جن میں مولوی مہدی حسن مرحوم کے انگریزی سفرنامے کا اردو ترجمہ گلگشت فرنگ اور کالیداس کے ڈرامے کا ترجمہ وکرم اروسی، شامل ہیں [۸۶]۔ وہ ''بہت ذہین، حوصلہ مند اور سچا ذوق رکھنے والے انسان'' اور نواب وقارالملک کے الفاظ میں ''سرسیّد کے لگائے ہوئے علمی چمن کے پہلے موسم گل کا ایک خوب صورت و شاداب پھول'' تھے [۸۷] ظفر علی خان حیدرآباد کے زمانہ ملازمت میں ان سے فیض یاب ہوئے اور انھوں نے سرسیّد احمد خان پر اپنے مونوگراف کا انتساب بدین الفاظ عزیز مرزا کے نام کیا:

> To Muhammad Aziz Mirza, Esq, B.A.,(ALIG) (Honours in History & English Literature), M.R.A.S., Secretary to His Highness the Nizam's Government, in the Judicial, Police and General Depts.
>
> The Writer Dedicates this short sketch of the Life of Sir Sayyad Ahmad Khan. As a slight testimony of his esteem and affection [88]

ملازمت کے زمانے میں عزیز مرزا ظفر علی خان کے لیے ایک اچھا آئیڈیل تھے۔ جب انھوں نے انگریزی کے افسانوی ادب کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا تو اس مرحلے میں بھی انھیں عزیز مرزا ہی مشورے کے لیے موزوں دکھائی دیے۔ ہنری رائیڈر ہیگرڈ Sir Henry Rider Haggard (۲۲/جون

۱۸۵۸ء.....۱۴؍مئی ۱۹۲۵ء) کے ناول *The People of the Mist* کے ترجمے کے سلسلے میں عزیز مرزا سے مشورے کا ذکر خود انھوں نے کیا ہے:

''میری خواہش تھی کہ کسی اعلیٰ درجہ کے انگریزی ناول کے خیالات ہی کو اپنی زبان میں ادا کیا جائے اور اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے جو ایک عمدہ ناول کے لیے ضروری ہیں میرے مخدوم محترم جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی اے معتمد مدارالمہام دولت آصفیہ محکمۂ عدالت کوتوالی و امور عامہ نے جو ایک بہت بڑے ادیب اور بہت بڑے سخن سنج ہیں اور جن کی متعدد تاریخی تصنیفات ان کی انشا پردازی اور وسیع معلومات کی شاہد ہیں، میرے اس خیال کو پسند فرمایا اور ارشاد کیا کہ اگر مسٹر رائیڈر ہیگرڈ جو زمانہ حال کے ایک بے نظیر انگریز ناول نویس ہیں، کے کسی ناول کو زبانِ اردو کا لباس پہنا دیا جائے تو جن عمدہ ناولوں کی ہندوستان کو ضرورت ہے، اس کے سلسلہ کا یہ پہلا حلقہ ہو جائے'' ۸۹ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان کی زبان تشکر ترجمان یوں گویا ہوتی ہے ''سب سے پہلے میں اپنے مخدوم محترم و مطاع محتشم عالی جناب محمد عزیز مرزا صاحب بی اے کا دلی شکریہ بجالاتا ہوں جن کی عنایت آمیز تحریک و ایما سے یہ کتاب لکھی گئی اور جنھوں نے نہایت مہربانی سے اس کی نظر ثانی کی......'' ۹۰ یہی نہیں خود عزیز مرزا کے قلم سے بھی ظفر علی خان کے ساتھ مشورت اور راہ نمائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بھی اس مشورے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے کرم فرما مولوی ظفر علی خان صاحب بی اے نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انھیں کوئی کتاب ترجمہ کے لیے منتخب کردوں تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ انھیں رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں میں سے کسی ناول کا ترجمہ کرنا چاہیے ....مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو علم ادب انگریزی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں، ترجمہ ایسی خوبی سے کیا ہے کہ باوجود مصنف کے زورِ بیاں کے قائم رکھنے کے، اردوئے معلیٰ کے روزمرہ محاوروں کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے......'' ۹۱

یہ تو عزیز مرزا کا ذکر تھا جن کا اثر ایک خاص زمانے تک ان پر رہا لیکن جس نے ظفر علی خان کی زندگی پر فیصلہ کن اثر ڈالا وہ غالباً جمال الدین افغانی کی شخصیت یا ان کے خیالات تھے جنھوں نے ظفر علی خان کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ سرکار انگریزی کی نظر میں پان اسلام ازم کے ایک بڑے داعی و مبلغ قرار پائے۔ یہاں تک کہ ان کے بدترین مخالف سر مائیکل اوڈوائر نے، جن کے خیالات بہ قول ظفر علی خان ''متناقض مہملات اور متہافت لغویات کی پوٹ'' اور جن کی پالیسی ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والی منطق کی مہملیت'' ۹۲ سے پُرتھی اپنی یادداشتوں میں انھیں شمالی ہند کی صحافتی دنیا میں پان اسلام ازم کا لیڈر قرار دیا۔ ۹۳

ظفر علی خان کی شاعری میں افغانی دکھائی نہیں دیتے البتہ جمال الدین افغان کے نام سے شائع ہونے والا ایک کتابچہ ان کی افغانی سے اثر پذیری کا ضرور اظہار کرتا ہے یہ کتابچہ پروفیسر ای جی براؤن کی *Persian Revolution* کے پہلے باب سے مستفاد ہے، بیشتر معلومات وہی ہیں جو براؤن نے پیش کی ہیں مثال کے طور پر

ایک اقتباس کے موازنے سے براؤن کے متن اور اس سے ظفر علی خان کے استفادے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: براؤن نے لکھا ہے:

> In 1882 the "Young Egyptian" movement, with which Sayyid Jamdlu'd-Din had identified himself, and which aimed primarily at limiting the Khedive's extravagance and autocratic power and checking foreign intervention and control, culminated in the revolt of 'Ardbi Pasha, the bombardment of Alexandria, the battle of Tel-el-Kebir and the British occupation. Before hostilities broke out Sayyid Jamalu'd-Din was summoned by the Indian Government from Haydar-abdd to Calcutta, and there detained until the struggle was over and the Egyptian Nationalists were defeated, when he was permitted to leave India. He came first to London, where he remained only a few days, and ۹۴ then went to Paris, where he abode for three years.

ظفر علی خان کی عبارت اس طرح سے ہے:

> ''القصہ ۱۸۸۲ء میں نوجوان مصریوں کی وہ تحریک جس کے ساتھ سیّد جمال الدین افغانی کو پوری ہمدردی تھی اور جس کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ خدیو کی مسرفانہ عادات اور غیر محدود اقتدارات کی اصلاح کر کے اغیار کی مداخلت اور مقابضت کا سدباب کیا جائے ۔عربی پاشا کے خروج ، اسکندریہ کی گولہ باری، تل الکبیر کی لڑائی اور برٹش قبضہ پر جامنتہی ہوئی ۔جنگ کے شروع ہونے سے پہلے گورنمنٹ ہند نے سیّد جمال الدین کو حیدرآباد سے کلکتہ بلالیا اور جب تک مصری قوم پرستوں کو شکست نہ ہوگئی انھیں وہیں روکے رکھا اس کے بعد انھیں ہندوستان سے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی چنانچہ کلکتہ سے وہ پہلے لندن اور وہاں سے پیرس گئے جہاں وہ تین سال تک رہے'' ۹۵

دونو اقتباسات میں ترجمے کے علاوہ کوئی اور تعلق ثابت کرنا دشوار ہے، اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ظفر علی خان کے کتابچے کی بنیاد پروفیسر براؤن ہی کی کتاب ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں پیش کی گئی معلومات، براؤن ہی کا ترجمہ ہیں لیکن آگے چل کر یہ کتابچہ ترجمے کی حدود سے نکل کر تبصرے کی حدود میں قدم رکھتا دکھائی دیتا ہے اور مضمون و خیال میں ظفر علی خان دکھائی دینے لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے براؤن کی

کتاب کے علاوہ بھی کچھ مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ شاید انھوں نے جرجی زیدان کی مشاہیر شرق (قاہرہ ۱۹۰۳ء) دیکھی ہو جو براؤن کے مآخذ میں ہے۔ کتابچے کے آخر میں انھوں نے براؤن کی آرا سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس کتابچے میں افغانی کی روح کو ''مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کے عروج کی فکر میں ہروقت غلطاں و پیچاں'' [۹۶] قرار دیا گیا ہے مصنف یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی دنیا کی بیداری کا ''اکثر حصہ سیّد جمال الدین کی کوششوں کا رہین منت ہے جنھوں نے جمود وغفلت کے طلسم کو توڑ کر موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی'' [۹۷] تاہم یہ امر دلچسپ ہے کہ افغانی سے اثر پذیری اور ان کی مدح سرائی کے باوصف ابھی تک ظفرعلی خان، سرسیّد کے دائرۂ اثر میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ انھیں براؤن کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ افغانی نے ایران، مصر، ترکی اور ہندوستان کی بیداری میں کردار ادا کیا ہے۔ ظفرعلی خان کا کہنا ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کی حد تک تو یہ بات درست مانی جاسکتی ہے لیکن ہندوستان کی بیداری میں بنیادی کردار سرسیّد احمد خان کا ہے۔ سرسیّد اور افغانی کی شخصیات اور طریق کار وطرزفکر میں جو بُعد ہے وہ دونو شخصیات کی زندگی ہی میں واضح ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیّد جمال الدین افغانی کا قریبی دوست ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ (۱۸۴۰ء.....۱۹۲۲ء) جو شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی اور بہت سے ہندوستانی نوجوانوں کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا، جب علی گڑھ گیا تو اسے دوسرے مقامات کے مقابلے میں یہاں کامیابی نہیں ملی اور یہاں کا جلسہ بھی ناکام رہا [۹۸]

ظفرعلی خان کا رجحان چونکہ سرسیّد کی جانب ہے اس لیے وہ بڑے واضح انداز میں براؤن کی تردید میں مسلمانانِ ہند کے زوال وادبار کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اس یاس آفریں حالت میں یکا یک رحمت حق کو حرکت ہونا اور اس رحمت کا حضور رحمت اللعالمین ﷺ کی آل اطہر کے برگزیدہ فرد یعنی سیّد احمد خان کی شکل میں ظاہر ہونا، سیّد احمد خان اپنے آنسوؤں سے اپنی قوم کے اس باغ کو جس میں سات کروڑ خزاں رسیدہ پودے پڑے ٹھٹھر رہے تھے سینچنا، اس کی آبیاری سے باغ میں پھر بہار آنا، جہالت و اوہام پرستی کے دَل بادل کا چھٹنا، اس متعصّبانہ مغائرت کا جو عیسائی حاکموں اور مسلمان محکوموں کے درمیان چلی آتی تھی گھٹنا، مسلمانوں کا اس سچے یقین کے ساتھ کہ ہندوستان کی حدود کے اندر انھیں اپنے پولیٹیکل تفوق کے احیا کی ضرورت نہیں ہے انگریزوں کے ساتھ اتحاد و یک جہتی کے عقیدت مندانہ تعلقات کرلینا، ان تعلقات کے استحکام میں انگریزوں کے اس طرزِ عمل کا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو انتظام حکومت میں خاص خاص مراعات کے ساتھ شریک کرلیا ہے حصہ لینا، اور اس طور پر دنیائے اسلام کے ہندوستانی خطہ میں بجائے اس کے کہ مسلمان اپنے سیاسی کھنڈروں پر ایک خالص اسلامی محل از سرنو تعمیر کرنا چاہیں ان کا ایک اینگلو مسلم محل کی تعمیر میں مصروف ہوجانا کیا یہ تمام واقعات پروفیسر براؤن تک نہیں پہنچے اور کیا یہ سیّد جمال الدین کے سانچے میں ڈھلے ہیں'' [۹۹]

اس اقتباس سے واضح ہے کہ ظفر علی خان ابھی ''خیر خواہ دولت برطانیہ'' کے مقام پر ہیں اور انھیں جمال الدین افغانی کے مقابلے میں سرسیّد کی شخصیت زیادہ پرکشش اور ان کی خدمات زیادہ غالب دکھائی دے رہی ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جہالت واوہام پرستی کے بادلوں اور مسلم عیسائی کشمکش سے سرسیّد نے نجات دلائی ہے اور ان کے لیے سیاسی حقوق کے حصول کی کوشش کو ترک کرکے برطانوی حکومت سے مراعات کے حصول کی راہ کھولی ہے اور انھیں سمجھایا ہے کہ وہ خاکِ ہندوستان میں کسی اسلامی محل کی تعمیر کی بجائے اینگلو مسلم محل کی تعمیر میں کوشاں ہوجائیں ۔ یہاں ہمیں اورنگ زیب عالمگیر پر لکھی گئی ظفر علی خان کی نظم یاد آتی ہے جس میں وہ اورنگ زیب کی بند آنکھوں میں بھی'' اک آنیوالی اسلامی حکومت'' کے خواب دیکھتے دکھائی دیتے ہیں [۱۰۰] لیکن یہاں وہ اینگلو مسلم محل کی تعمیر پر راضی ہیں ۔ یہ تمام خیالات وہی ہیں جو سرسیّد اور ان کی تحریک کا لازمی نتیجہ تھے۔ ظفر علی خان،افغانی سے متعلق لکھے گئے اس کتابچے میں،سرسیّد کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جس شخص نے جگایاانھیں حصلیض ملت (سہو کتابت ہے،حضیض ذلت ہونا چاہیے تھا بمعنی ذلت کی پستی) سے نکال کر اوجِ عزت پر جس شخص کی مساعی جمیلہ نے پہنچایاوہ سیّداحمد خان ہے جواپنی زبردست شخصیت اور حیرت انگیز قابلیتِ دل ودماغ کے لحاظ سے کسی طرح سیّد جمال الدین سے کم نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ کئی ایک اعتبار سے اس پر بھی فوقیت رکھتاہے'' [۱۰۱]

اس کتابچے پر سنہ اشاعت درج نہیں جس کی مدد سے زمانہ تصنیف کا علم ہوسکے ،جس وقت کے یہ خیالات ہیں غالبًا یہ ان کی سیاسی زندگی کاابتدائی دور ہے ۔براؤن کی کتاب ۱۹۰۹ءتک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے اور ۱۹۱۰ء میں کیمبرج یونی ورسٹی پریس سے شائع ہوئی تھی اس لیے یہ تو واضح ہے کہ ظفر علی خان کی تحریر ۱۹۱۰ء کے بعد کی ہے اور ۱۹۱۱ء کے پنجاب ریویو میں اس کی اشاعت یہ تعین بھی کردیتی ہے کہ یہ تحریر ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان کی ہے ۔یہ زمانہ ہے جب وہ زمیندار کی ادارت سنبھال چکے تھے،زمیندار میں بھی یہ تحریر بالاقساط شائع ہوئی لیکن یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے(۴/مارچ وبہ بعد) کتابچے کی صورت میں یہ تحریر پنجاب ریویو میں اشاعت کے بعد کسی وقت شائع ہوئی ہوگی ۔کتابچہ کارخانہ صوفی آب حیات پنڈی بہاءالدین ضلع گجرات کا شائع کردہ ہے ۔ سرورق پر مصنف کے نام کے ساتھ' شہید ملت' کا لقب درج ہے ،ظفر علی خان کے مداح انھیں'' ظفر الملت والدّین'' کہا کرتے تھے،یہ لقب غریب ہے اور اس کتابچے کے علاوہ ان کے نام کے ساتھ کہیں اور دکھائی نہیں دیا ۔یہ کتابچہ ایک باراور شائع ہوا ہمیں اس کی یہ اشاعت دیکھنے کا بھی موقع ملا ہے ۔یہ اشاعت بھی کسی تاریخ کے اندراج سے محروم ہے سرورق پر درج عبارت کے مطابق یہ کتابچہ'' اتحاداسلامی کے محرک اعظم مصر،ٹرکی،ایران اور ہندوستان کے ذریعہ تمام عالم اسلام میں حریت وآزادی کی روح پھونکنے والے مجددِ اعظم علامہ سیّد جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے سبق آموز حالات زندگی''،پرمشتمل ہے [۱۰۲]

سرسیّد کے نیازمنداور مداح ہوتے ہوئے جب وہ افغانی کی مدح میں یہ کتابچہ لکھ رہے تھے تو غالبًا افغانی کی

وہ تحریریں ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں جن میں افغانی نے سرسیّد پر کڑی تنقید کی ہے۔ یہاں انھوں نے سرسیّد کی خدمات اور شخصیت کو افغانی پر فائق قرار دیا ہے۔ افغانی اپنے خیالات کے اظہار میں بہت شدید تھے۔ جس کا ایک نمونہ ان کی تصنیف الردعلی الدہریین ہے۔[۱۰۳] ان کی دوسری تحریریں بھی شدت وحدت میں اس کی مثل ہیں انھوں نے سرسیّد اور ان کے عقائد کے حوالے سے جو کچھ کہا اگر ظفرعلی خان کی نظر سے گزرتا تو وہ جانے کیا کہتے؟ افغانی سے حیدرآباددکن کے محمد واصل نامی ایک مدرّس نے ہندوستان میں نیچریوں کے بڑھتے ہوئے اثرات اور بڑھتی ہوئی تعداد کے حوالے سے نیچریت کی حقیقت جاننا چاہی تو افغانی نے اس استفسار کا جو جواب دیا وہ ردنیچریہ نامی رسالے کی صورت میں محفوظ ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''یہ لوگ علم و دانش اور معرفت کا کوئی حصہ نہیں رکھتے بلکہ ان میں تو انسانیت بھی نہیں ہے اور یہ لوگ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان سے سوال جواب کیا جائے یا ان سے خطاب کیا جائے اور اگر کوئی قابلیت ان میں ہے تو وہ یہ کہ اگر تھیٹریا کٹ پتلیوں کے تماشے میں اقوام متمدن کے حالات کی نقل کی ضرورت ہو تو بخوبی کام آسکتے ہیں''۔[۱۰۴] اسی پر بس نہیں انھوں نے حیدرآباددکن کے زمانہ قیام میں ایک رسالہ شرح حال اگھوریاں بھی لکھا جس میں ان کی شعلہ بیانی اور طنز واستہزا اس سے بھی بڑھے ہوئے ہیں:

> ''سگ از برای استحصال استخوانی تملق می کند و دمی رکت (دُمی راحرکت؟) می دہدو سر بر پای معطی نہادہ چہ خودی باشد چہ بیگانہ بہ جہت اظہار خلوص نیت روزہا درمی دہد۔ انسان از سگ ہم کمتر است، لاحول ولا ۔۔۔ انسان را چنان می زیبد کہ در تملق وخضوع ہزار مرحلہ بہ سگ ہا بیشی گیرد و اگر دُم ندارد ریش ہم کم از ان نیست .....''[۱۰۵]

تاہم تاریخی اور زمانی ترتیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ظفرعلی خان کی شخصیت پر ابتدائی طور پر تو سرسیّد اور علی گڑھ ہی سے متعلق شخصیات کا اثر غالب دکھائی دیتا ہے مثلاً شبلی، آرنلڈ، محسن الملک یا عزیز مرزا، حتیٰ کہ ان کے والد گرامی بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ علی گڑھ کے سحر سے نکلتے چلے گئے کہ بالآخر ان کا تعارف ایک پین اسلامسٹ کی حیثیت سے ہونے والا تھا۔ ظفرعلی خان کی اپنی تحریریں، تقریریں اور برطانوی حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیاں ان کی بے باکانہ شاعری جس میں وہ جذبہ حب وطن کی بے پناہی کی قسم کھا کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ نہیں سکتا ......سب اسی پر دال ہیں۔ لاہور میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی صدارت میں آزادی ہند کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> ''انگریز اقتدار کے نشہ میں اس بُری طرح بدمست ہیں کہ انھیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہو رہا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ وہ ۱۹۳۶ء میں بھی ہم سے وہی سلوک کر رہا ہے جو اُس نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے کیا تھا۔ اس کو آج ۶۳ برس بعد بھی اس کا اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا کارواں سرگرم ہے۔ ہم اس مقام پر ہیں کہ اب ع
>
> ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن ہم لچک سکتے نہیں

قدرت نے ہم میں ہمالہ کی بلندی، بحرِ ہند کی گہرائی اور گنگا و جمنا کی روانی پیدا کر دی ہے۔ ہمارا کارواں مرتّب ہو چکا ہے .... حُدی خوانوں کے نغمے ہیں۔ جوانی کی امنگ و ترنگ ہے اور ہم سے ٹکرانے والے نوٹ کر لیں کہ وہ ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ اپنی آزادی کے لیے ہم بے پناہ ہو گئے ہیں۔ ہم بنیانِ مرصوص ہیں۔ ہم نے اپنے اختلاف کی خلیج پاٹ دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ طاقت اپنی جگہ خالی کرنے کے لیے طاقت چاہتی ہے۔ انگریز کا ہندوستان سے نکل جانا مقدر ہو چکا ہے۔ ہم ایک طوفان کی طرح اُٹھیں گے اور اس کی سلطنت کے کرّ وفر کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گے۔ افسوس ان ٹوڈیانِ کرام اور وفادارانِ عظام پر ہے جو انگریز کے اشارہ چشم و ابرو کی شہ پا کر مٹھی میں ہوا تھامتے اور آسمانوں میں تھگلی لگاتے ہیں۔ انھیں اس بدیہی حقیقت کا احساس ہی نہیں کہ برطانوی سلطنت ہندوستان کے لیے ایلوا ہو چکی ہے اور اس طرح محو ہو رہی ہے جس طرح صبح ہوتے ہی آنکھوں سے رات کا کاجل بہہ جاتا اور پیشانیوں سے قشقہ اُتر جاتا ہے۔" [۱۰۶]

ظفر علی خان نے علی گڑھ میں، سرکار سے ٹکرائے بغیر قومی مفادات کے حصول کا سبق پڑھا تھا اسی لیے ان کے اخبار کی پیشانی پر ایک مدت تک "تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو+ سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار"......جیسا شعر ثبت رہا اور وہ کونسلوں میں وطن کی گم گشتہ عزت کو ڈھونڈتے رہے لیکن بالآخر ان پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ گرمیِ گفتار اعضائے مجالس، سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کے سوا کچھ نہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو قومیں اپنی حالت خود تبدیل نہیں کرتیں خدا بھی ان کی حالت تبدیل نہیں کرتا چنانچہ انھوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علی الاعلان جدوجہد کی راہ اختیار کی۔ اکبر الہ آبادی نے تمثیلی پیرائے میں علی گڑھ کو ایک معزز پیٹ سے تشبیہہ دی تھی جب کہ اس کے مقابلے میں دیوبند اور ندوہ دل روشن اور زبان ہوش مند قرار پائے تھے۔ [۱۰۷] ظفر علی خان نے ان تینوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد سرفروشی کا راستہ اختیار کیا۔ اس راہ میں ان کی جرات و ہمت کا اعتراف اپنوں اور غیروں سبھی نے کیا۔ مولانا شبلی نے یہ کہہ کر ظفر علی خان کی جرات وہمت کو خراج تحسین پیش کیا کہ "علی گڑھ کو محمد علی کی ذہانت اور ظفر علی خان کی جرات پر ہمیشہ ناز رہے گا" [۱۰۸]

شبلی تو ظفر علی خان کے استاد تھے، عربی میں کہا جاتا ہے کہ الفضل ماشهدت به الاعدا ۔ حسن تو وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اعتراف ہو۔ کراچی کانگریس سے نماز کے مسئلے پر اختلاف ہو جانے کے بعد جب ظفر علی خان نے دلیرانہ اعلان کیا کہ "ادب نماز کے اوقات کا وہ سیکھے گی+ میں کانگرس کو مسلماں بنا کے چھوڑوں گا" تو گاندھی جی نے ظفر علی خان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "میں مولانا ظفر علی خان کی عزت کرتا ہوں۔ وہ اپنی دھن کے پکے ہیں ہمیں ان سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے دیش کے لیے بڑی بڑی کٹھنائیں سہی ہیں" [۱۰۹] جواہر لال نہرو کا کہنا تھا کہ "یہ صحیح ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی سیاسیات میں مختلف راستہ اختیار کرتے چلے گئے کچھ بھی ہو لیکن اس میں تو شک نہیں کہ مولانا ظفر علی خان غیر ملکی حکومت کے خلاف بڑی جوانمردی سے لڑتے رہے ہیں" [۱۱۰]

ان تفصیلات سے اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ظفر علی خان علی گڑھ کے پروردہ ضرور تھے اور علی گڑھ کو ان کے دل

میں ایک بلند مقام حاصل رہا لیکن سیاست میں وہ سرسیّد کے موقف سے بہت آگے نکل گئے تھے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ابتدا میں جارج خامس کو ہندوستانیوں کی جانوں کا مالک تسلیم کرنے والا ظفرعلی خان [۱۱۱] اپنی زندگی کے اس ترقی یافتہ مرحلے میں دلیرانہ کہتا ہوا پایا جاتا ہے ''جوگردن خدا کے حضور میں جھکنے کی عادی ہے وہ برطانوی اقتدار کی دہلیز پر کبھی سرنگوں نہیں ہوسکتی جس جبینِ نیاز پر توحید کی مہر ثبت ہوچکی ہے وہ جبینِ انگریز کے آستانہء جلال پر کبھی جھک نہیں سکتی۔میری زندگی وطن کی آزادی کے لیے وقف ہے، میرا یہ مقصدِ حیات ہے کہ یہ گوری چمڑی والے مہذّب ڈاکو میری زندگی میں سرزمینِ ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹ کر جس سرزمین سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں'' [۱۱۲]

حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ کے بعد ظفرعلی خان کی ساری جدوجہد غیرملکی سامراج کے خلاف بغاوت ہی کی جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں سرفروشی کی اس داستان نے جنم لیا جس کا طرازعنوان قربانی ہے۔کم وبیش چودہ برس پس دیوارزنداں گزاردینے کے اسباب جاننے کی خواہش رکھنے والوں اور اپنے جرم کی تلاش کرنے والوں کو ظفرعلی خان نے بتادیا تھا کہ میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے صدوپنجاہ سالہ غلامی کا راز فاش کردیا اور قوم کو یہ پیغام دیا کہ۔

منزل حق کے رہ رود سرسے کفن لپیٹ لو
تیغ بکف مجاہدو وقت ہے امتحان کا [۱۱۳]

حوالے اور حواشی:

(۱) سراج الدین احمد (مضمون نمبر ۳۹) الدعاوالاستجابۃ بحضور قبلہ وکعبہ ام آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خان صاحب مدظلھم در تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۱۱ یکم شعبان ۱۳۱۳ھجری سنۃ ۱۳۲۵ نبوی ص ۱

(۲) سرسیّد احمد خان استجابت دعا کی نسبت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف اشارہ در آخری مضامین سرسیّد مرتبہ مولوی محمد امام الدین گجراتی لاہور: رفاہ عام پریس ۱۸۹۸ء ص ۴۷

(۳) ایضاً

(۴) المفتقر الی اللہ الصمد السید احمد الدعاوالاستجابہ آگرہ: مطبع مفید عام بہ اہتمام منشی قادرعلی خان صوفی ۱۸۹۲ء ص ۸۔سرسید کا سوال استجابت سے متعلق تھا نفس دعا پر نہیں۔

(۵) پہلا جملہ'' دوآدمی عجب پیدا ہوئے ہندوستان میں......'' سیدنذیرنیازی صاحب نے ایک گفتگو میں روایت کیا (دیکھیے :ڈاکٹرخورشیدرضوی سیدنذیرنیازی سے ایک مکالمہ در اطراف لاہور:اردواکیڈمی پاکستان ۲۰۰۳ء ص ۱۳۸)دوسرا جملہ؛''دعا کے بارے میں سرسیداحمد خان اور مرزاصاحب نے انتہا کردی'' نیازی صاحب ہی کی ایک کتاب میں منقول ہے ،اس جملے اور اس پر مستزاد رائے کہ،زندگی''ایک مسلسل دعا'' ہے اور یہ کہ دعا میں جونکتہ پوشیدہ ہے اس کو سمجھے تو ابن خلدون یا ابن عربی'' (دیکھیے سیدنذیرنیازی اقبال کے حضور ، نشستیں اور گفتگوئیں [ایک بیاض یادداشت] لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۰ء صص ۳۵۹،۳۹۰)

(۶) شورش کاشمیری ظفرعلی خان لاہور:مطبوعات چٹان ۱۹۵۷ء صص ۳۹،۴۷
(۷) سیّدالطاف علی بریلوی و پروفیسرایوب قادری علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۷۰ء ص۹۴
(۸) ایضاً ص۹۵
(۹) ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ذکرفراہی لاہور: دارالتذکیر ۲۰۰۲ء ص ۱۵۵
(۱۰) سرسیّداحمد خان انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مرتبہ اصغرعباس لکھنو: اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۸۲ء ص۸۲
(۱۱) ایضاً
(۱۲) شورش کاشمیری ص ۳۴
(۱۳) عنایت اللہ نسیم سوہدروی ظفرعلی خان اور ان کا عہد لاہور: اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۲ء ص ۳۰
(۱۴) عبدالمجید سالک ''ظفرعلی خان علی گڑھ کا مایہ ناز انشاپرداز شاعر'' در علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر مرتبہ نسیم قریشی علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی ۱۹۵۴ء۔۔۱۹۵۳ء ، ۵۵۔۱۹۵۴ء ص ۵۹
(۱۵) مشمولہ بازیافت تحقیقی مجلّہ شعبہ اردو ، شبلی نمبر، لاہور : شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج شمارہ ۲۷ ، جولائی ۲۰۱۵ء
(۱۶) ظفرعلی خان در پنجاب ریویو ج ۱ نمبر۲ ص ۳۷ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ظفرعلی خان، ادیب و شاعر ،لاہور: مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۷ء ص ۷۲،۷۳
(۱۷) جان ولیم ڈریپر معرکہ مذہب و سائنس مترجمہ ظفرعلی خان لاہور: الفیصل ناشران ۱۹۹۵ء ص۳
(۱۸) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مولاناظفرعلی خان حیات خدمات و آثار لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء ص ۲۸ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے یہی اقتباس ظفرعلی خان پر اپنی پہلی کتاب ظفر علی خان ادیب و شاعر (لاہور: خیابان ادب ۱۹۶۷ء ص۱۱۴) میں بھی درج کیا ہے لیکن دونو جگہ اپنے مآخذ کا حوالہ نہیں دیا ۔ہم نے سرسیّد احمد خان کے خطوط کے تین دستیاب مجموعوں (مکتوبات سرسید یک جلدی مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لاہور؛ مجلس ترقی ادب ۱۹۵۹ء، مکاتیب سرسیداحمدخان حصہ اول و دوم مرتبہ مشتاق حسین علی گڑھ: فرنڈس بک ہاؤس ۱۹۶۰ء، مکتوبات سرسید جلد اول مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لاہور: مجلس ترقی ادب طبع ثانی جون ۱۹۷۶ء ، مکتوبات سرسید جلد دوم مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لاہور: مجلس ترقی ادب طبع ثانی جون ۱۹۸۵ء) میں نواب محسن الملک کے نام سرسیّد کے خطوط پر نگاہ ڈالی تو ان میں یہ اقتباس نہیں ملا۔ واللہ اعلم بالصواب

(19) *A Monograph on Sir Sayyad Ahmad Khan* being An Address delivered by Mr Zafar Ali Khan,B.A.,(Alig), Assistant Secretary to H.H..the Nizam's Government, in the Judicial, Police and General Departments, at a public meeting, held in Hyderabad (Deccan),on the

27th of March 1908, under the Presidency of M. A. Hydari, Esq, B.A., Financial Secretary to H. H. Nizam's Government, to commemorate the 12th Anniversary of Sir Sayyad's death.

Secunderabad: Cheekoty Veerannah & Sons, Printers. 1908

ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ۲۰۱۶ء میں یہ کتابچہ مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ کی طرف سے راجہ اسد علی خان نے ازسرنو شائع کیا گیا ہے۔قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے حواشی میں اسی اشاعت کے صفحات نمبر درج کیے ہیں۔

(20) Eminent educationist, an astute politician, a brilliant orator, an elegant man of letters, a sound dialectician, an indefatigable archaeologist and a born engineer....Maulana zafar Ali Khan, ***A Monograph on Sir Sayyad Ahmad Khan*** Lahore;Maulana Zafar Ali Khan Trust 2016 p11

(21) While as a student he was still less promising.,In Arabic his knowledge was limited to such preliminary works as the *Sharah Mullah,* the *Sharah Tahzib,* the *Maibzi* and the *Mukhtasar Maani*. *Ibid* p17

(22) His power of observation is extraordinary.*Ibid* p33

(23) Thus, by dint of untiring energy and indefatigable perseverance.*Ibid* p41

(۲۴) مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ کی جانب سے شائع کردہ اس کتابچے مطبوعہ اپریل ۲۰۱۶ء کے صفحات ۲۴،۲۵ پر درج غالب کی اس غزل میں چند در چند تسامحات راہ پا گئے ہیں، ذیل میں ان تسامحات کی تصحیح کی جارہی ہے۔

مطلع کا پہلا مصرعہ درروزگار ہانہ تواند...... ہے جو درروزگار ہا تواند......شائع ہوگیا ہے

ساتویں شعر میں رہزن متاع خویش کی جگہ ''رہزن مقاع خویش'' شائع ہوا ہے

آٹھویں شعر کے دوسرے مصرعے میں ''ور'' کو''وز'' بنادیا گیا ہے

نویں شعر کے دوسرے مصرعے میں ''رخت خوابش'' کو''رخت خواہش'' لکھا گیا ہے

گیارھویں شعر کے پہلے مصرعے میں ''آئین سرورے'' درج ہے جب کہ غالب نے یہاں'' آئین خسروی '' کہا تھا اگر اختلاف متن بھی تسلیم کیا جائے تو یہاں'' آئین سرورے''نہیں آئین سروری'' ہونا چاہیے تھا۔

بارھویں شعر کا پہلا مصرعہ ''برخستگان ہند بخشوداز کرم'' درج ہے جس سے مصرعہ وزن ہی سے خارج ہوگیا ہے ،درست مصرعہ''برخستگان ہند بہ بخشوداز کرم'' ہے۔

موازنے کے لیے دیکھیے مرزا اسداللہ خان غالب قصیدہ درمدح وکٹوریا شمارہ ۳۰ در قصائد و مثنویات فارسی مرتبہ غلام رسول مہر لاہور: مجلس یادگار غالب، پنجاب یونی ورسٹی ۱۹۶۹ء ص ۲۳۲ وبعد

(25) He made up his mind to migrate to Egypt.***op-cit*** p26

(26) His wife with whom he had spent a life of ideal matrimony died and his friends asked him to contract a second marriage,he refused to listen to their advice for the same reason,and having dedicated himself to the cause of Muslim revival ***op-cit*** P-26

(27) Sir Sayyad Ahmad Khan had the germs of greatness imbedded in the innermost recesses of his soul.***op-cit*** p.18

(28) The influence of Mirza Ghalib's Urdu-i-Mualla is clearly discernible in the chaste and inimitable style of Sir Sayyad.***op-cit*** p18

(29) (i) M. Garcon de Tassy, the eminent orientalist, translated the work into French and the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland marked its sense of Sir Sayyad's valuable contribution to the work of antiquarian research by electing him an honorary member.***op-cit*** p20

(ii) This book which treats of the antiquarian remains of Delhi possesses a unique scientific merit ***op-cit*** p20

(30) ***op-cit*** p.48

اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگ شعر کی جانب عام التفات رکھتے تھے،سرسیّد احمد خان بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے، وہ شاعری میں آسی تخلص کرتے تھے ان کی شاعری کا ایک اور نمونہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

فلاطون طفلکی باشد زیونانی کہ من دارم — مسیحا رشک می آرد زدرمانی کہ من دارم
زکفرمن چہ می خواہی زایمانم چہ می پرسی — ہمان یک جرعہ عشق است ایمانی کہ من دارم
خدادارم دل برہان زعشق مصطفیٰ دارم — نہ دارد ہیچ کافرسازوسامانی کہ من دارم
زجبریل امین قرآن بہ پیغامی نمی خوانم — ہمہ گفتارمعشوق است قرآنی کہ من دارم
فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت — ہزاران مطلع ہا داردگریبانی کہ من دارم

زبرہان تابہ ایمان سنگ ہا دارد رہ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ ہم چو برہانی کہ من دارم

(31) ***op-cit*** p 53

(۳۲) الطاف حسین حالی حیات جاوید لاہور:عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۵ء ص۲۵۹

(33) To which the renaissance of Islam in this country ***op-cit*** p7

(34) Self help, self sacrifice and self reverence
Guide, philosopher and friend

(35) It is a life which urges us to be good subjects when our capacity to be good rulers has become extinct. ***op-cit*** p8

(36) It assures us that a little earnestness, when combined, help a man in the accomplishment of labours which even a Hercules could not undertake with confidence.***op-cit*** p10

(37) In his memorable brochure dealing with the causes which led to the upheaval of 1857 ,a work by the way,which may be regarded as a Decalogue of the fundamental political needs of India.***op-cit*** p 27

(38) The mutiny owed its origin to the absence of indigenous element in the legislature and to the fact that Englishmen and Indians were a prey to mutual misunderstandings.***op-cit*** p27

(39) Central idea dominating Sir Sayyad's mind was to bring about a union between the East and the West.

(40) Sir Sayyad was firmly convined that to promote intimacy between Oriental and Occidental ways of thought, it was absolutely necessary that Standard English works should be translated into Urdu. ***op-cit*** p30

(41) Sayyad Ahmad Khan had an unlimited fund of temerity at his disposal and he forthwith commenced his operations. ***op-cit*** p28

(42) He was perfectly right in thinking that a common language for the whole of India was essential to the future development of a common Indian nationality.

(43) He had tried to create a common platform for the two communities, but one of them preferred to remain aloof. ***op-cit*** p32

(44) He had kindled a new fire in the dormant furnace of Islam. p54

(45) He was equally anxious with the most ardent supporter of female education to see the girls brought up and educated in a proper manner. ***op-cit*** p52

(۴۶) حیات جاوید ص۵۷۷

(۴۷) ایضاً ص۵۷۷

(48) He was of opinion that the current system of domestic education whereby girls from their mothers and grand mothers was beneficial to the community in its present stage. ***op-cit*** p-52

(49) He expressed a hope that the time was not distant when the enfranchisement of woman within her own proper sphere would become an accomplished fact. ***op-cit*** p-52

(۵۰) مختار مسعود حرف شوق لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت ۲۰۱۷ء ص ۲۵۵

(51) Its doors are open to Hindus and Muhammadans, Christians and Parsis alike ***op-cit*** p-44

(52) I was struck by the sight of the Shia and Sunni praying side by side. ***op-cit*** p-46

This strictly Muhammadan institution have thrown open their doors to the youth of all races and creeds. Among the 259 students, I find 57 Hindus of nearly one-fourth of the whole Christian and Parsi lads have also received a liberal education within its walls.***op-cit*** p47

(۵۳) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۲۰۳

(۵۵،۵۴) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۲۰۴ تا ۲۰۷

(۵۶) صائمہ قدیر و فرزانہ عباس۔مرتبین سرسیّداحمد خان منظوم خراج عقیدت ادارت ڈاکٹر نسیم فاطمہ کراچی: بزم اکبر ۲۰۱۷ء ص ۹۱

(۵۷) مختار مسعود آواز دوست لاہور: شاہ بیگم اور شیخ عطاء اللہ ٹرسٹ فروری ۲۰۱۷ء ص ۱۳۴

(۵۸) علی گڑھ میگزین شمارۂ خصوصی علی گڑھ نمبر ایڈیٹر نسیم قریشی علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی ۱۹۵۳ء......۱۹۵۴ء ---۵۵......۱۹۵۴ء ص ۶۶

(۵۹) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۴۹

(۶۰) ظفر علی خان بہارستان لاہور: : اردو اکیڈیمی پنجاب ۱۹۳۷ء ص ۱۰۱

(۶۱) ایضاً

(۶۲) ایضاً

(۶۳) ایضاً ص ۶۰۳

(۶۴) ایضاً

(65) LIEUT.-COLONEL G. F. .GRAHAM B. s. c. *THE LIFE AND WORK OF SYED AHMED KHAN* c. s. I. LONDON: WILLIAM BLACKWOOD AND SONS EDINBURGH AND MDCCCLXXXV 1885 p275

(۶۶) آواز دوست ص ۱۳۶

(۶۷) شورش کاشمیری ص ۲۲۵،۲۲۶

(۶۸) ظفرعلی خان چمنستان لاہور: پبلشرز یونائٹڈ ص۸۶

(۶۹) چمنستان ص۱۵۴ نظم کا نام ہے'' ملت بیضا کے نورنظر'' یہ نظم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی یونین میں ۴رنومبر۱۹۳۷ء کو کہی گئی/ کلیات ظفرعلی خان ص۵۶۸

(۷۰) ظفرعلی خان بہارستان دارالاشاعت بہارستان گجرات ص۶۸۷ اردواکیڈیمی ص۸۰۱ کلیات ظفرعلی خان ص۵۶۷

(۷۱) بہارستان لاہور: مکتبہ کارواں س۔ن ص۵۶۳

(۷۲) بہارستان اردواکیڈیمی ص۸۰۱

(۷۳) بہارستان دارالاشاعت گجرات ص۶۸۷

(۷۴) میرزااسداللہ خان غالب دیوان غالب لاہور: مجلس یادگارغالب، پنجاب یونی ورسٹی ۱۹۶۹ء ص۵۳

(۷۵) بہارستان مکتبہ کاروان ص ۵۶۵/کلیات ظفرعلی خان ص ۵۶۸

(۷۶) میرزااسداللہ خان غالب قطعات ،رباعیات ترکیب بند،ترجیع بند مخمس باہتمام غلام رسول مہر لاہور: مجلس یادگارغالب، پنجاب یونی ورسٹی ۱۹۶۹ء ص۴۰

(۷۷) بہارستان کاروان ص۵۶۲/ کلیات ظفرعلی خان ص۵۶۶

(۷۸) دیکھیے بہارستان کاروان ص۵۶۵

(۷۹) دیکھیے بہارستان و کلیات ظفرعلی خان ٹرسٹ ص۵۶۹

(۸۰) بہارستان دارالاشاعت بہارستان گجرات ص ۶۸۷

(۸۱) بہارستان اردواکیڈیمی ص۸۰۲

(۸۲) نگارستان لاہور: الفیصل ناشران ۲۰۰۷ء ص ۱۶۵

(۸۳) شورش کاشمیری ص ۳۲

(۸۴) ماخوذ از مقدمہ نواب وقارالملک مرحوم خیالات عزیز مرتبہ منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۶۱ء ص ص ۵۔۱۹

(۸۵) ایضاً ص۱۶

(۸۶) ان کتب کے علاوہ مسلم پالیٹکس اور مسلم یونی ورسٹی کے نام سے مختصر رسالے بھی لکھے جن کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے ، انھوں نے متعدد کتب کے اردو تراجم کروائے اور صدہا مسلمانوں کو ملازمت دلوائی۔وہ ستمبر۱۹۰۹ء میں خدمتِ سرکار سے سبکدوش کردیے گئے ۔آغا خان کے اصرار پر مسلم لیگ کے آنریری سیکریٹری بنائے گئے ۔۲۶رفروری ۱۹۱۲ء کو انتقال کیا۔ان کے احوال پر پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ایک کتاب محفل عزیز یعنی محمد عزیز مرزا کی حیات اور ان کا دور ازمولوی قمرالدین احمد بدایونی الحمد پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء موجود ہے۔

(۸۷) خیالات عزیز محولہ بالا

(88) *A Monograph on Sir Sayyad Ahmad Khan being An Address* delivered by

Mr Zafar Ali Khan, B.A.,(Alig) P 3

(۸۹) ظفر علی خان سیر ظلمات باتصویر حیدرآباد: مطبع شمسی واقع حیدرآباد دکن میں باہتمام محمد ابراہیم خان اکبرآبادی طبع ہوئی س۔ن/۱۹۰۰ء ص ۶

(۹۰) ایضاً ص ۸

(۹۱) تمہید از چکیدۂ خامہء بلاغت شمامہء فاضل تحریر ادیب بے نظیر عالی جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی اے آنرز فیلو آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی وہوم سیکریٹری گورنمنٹ نظام جاوید قیام صانها الله تعالیٰ عن شرالایام ایضاً ص ۱۶

(۹۲) ظفر علی خان سر مائیکل اوڈوائر کا تازہ کلام، ہندوستان کی دائمی غلامی کے لیے رجعت پسند انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش در روزنامہ زمیندار لاہور ۲۱؍جون ۱۹۲۷ء بحوالہ انمول موتی لاہور: طور منزل دل محمد روڈ ۱۹۶۸ء حصہ اول ص ۱۹۰، ۱۹۳

(93) Sir Michael O'Dwyer, Chapter xi ***India as I knew it*** 1885-1925 London Constable & Company Ltd. 1925.

(94) See First chapter Sayyid Jamdlu'd-Di'n, the Protagonist of Pan-Islamism of ***THE PERSIAN REVOLUTION OF 1905 1909*** BY EDWARD G. BROWNE, M.A., M.B., F.B.A., SIR THOMAS ADAMs' PROFESSOR OF ARABIC AND FELLOW OF PEMBROKE COLLEGE IN THE UNIVERSITY OF CAMBRIDGE Cambridge : the University Press 1910

(۹۵) شہید ملت مولانا ظفر علی خان صاحب بی اے (علیگ) زمانہ حال کے سیاسی لیڈروں کے حالات کا سلسلہ جمال الدین افغان رحمة الله عليه کے حالات زندگی لاہور: مطبع اسلامیہ سٹیم پریس س۔ن ص ۱۶۔۱۷

(۹۶) ایضاً ص ۲۳

(۹۷) ایضاً ص ۳۰

(۹۸) وہ سرسید سے مل کر بھی مایوس ہوا اس نے اپنی ڈائری میں سرسید کے اظہار وفاداری کے علی الرغم ان کا ذکر بڑے مایوس کن انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"I am rather disappointed in Seyd Ahmed. He is certainly a beau vieillard, but does not inspire me with entire confidence. His features are coarse, his hands coarse, and I should not be surprised if he turned out to be a faux bonhomme."

Wilfird Scawen Blunt ***India Under Rippon : A Private Diary*** Secret History of the English Occupatation of Egypt" London: T Fisher unvin 1909 P.156

(۹۹) سیّدجمال الدین افغان رحمۃ اللہ علیہ ص۲۹

(۱۰۰) اک آنے والی اسلامی حکومت کے تصور میں

لحد میں بھی کھلی ہے اس کی چشمِ انتظار اب تک

ظفرعلی خان نظم شان اورنگ زیب در بہارستان لاہور: اردو اکیڈمی پنجاب ۱۹۳۷ء ص۱۱۲

(۱۰۱) سیّدجمال الدین افغان رحمۃ اللہ علیہ ص۲۹،۳۰

(۱۰۲) ظفر برادرس تاجران کتب لاہور کا سلسلہ تالیفات نمبر۵...... جمال الدین افغانی ......یعنی اتحاداسلامی کے محرکِ اعظم مصر، ٹرکی، ایران اور ہندوستان کے ذریعہ تمام عالمِ اسلام میں حریت وآزادی کی روح پھونکنے والے مجددِ اعظم علامہ سیّد جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے سبق آموز حالات زندگی ......ازقلم......مولانا ظفرعلی خان صاحب، بی اے، ایڈیٹر زمیندار ......جسکو......ظفر بردرس تاجران کتب لاہور نے ...... جارج سٹیم پریس لاہور میں باہتمام ایشرداس، پرنٹر چھپوایا۔ سنہ ندارد۔ مولانا ظفرعلی خان ٹرسٹ لاہور نے اپریل ۲۰۱۶ء میں یہ کتابچہ ایک بار پھر شائع کیا۔ پنجاب ریویو اور زمیندار میں اشاعت کی تاریخوں کے لیے دیکھیے یہی اشاعت ص۳۵

(۱۰۳) سیّد جمال الدین الافغانی الردعلی الدھریین ترجمہ محمد عبدہ بیروت :۱۹۸۱ء اس رسالے کا ایک انتخاب ڈاکٹر یوسف اپیش اور جاپانی فاضل پروفیسر کوسوجی یاسوشی نے بھی شائع کیا ہے۔ دیکھیے : تراث الفکر السیاسی والاسلامی بیروت: تراث ۲۰۰۵ء ص۴۷۳تا۴۸۲

(۱۰۴) سیّد جمال الدین افغانی ردنیچیریت لاہور: مکتبہ شعروادب س۔ن ص ص۷۹،۸۰

(۱۰۵) قاضی عبدالغفار آثارجمال الدین افغانی لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء ص۹۶،۹۷

(۱۰۶) شورش کاشمیری فنِ خطابت لاہور: مطبوعاتِ چٹان ۱۹۸۲ء ص۷۸۔۷۸

(۱۰۷) اکبرالہ آبادی کلیات اکبر الہ آبادی کراچی: پنجاب پبلشرز س۔ن حصہ اول ص۴۳

(۱۰۸) ظفرعلی خان اور ان کا عہد ص۲۹

(۱۰۹) ظفرعلی خان ادیب شاعر ص۱۱۶

(۱۱۰) ایضاً ص۱۱۶

(۱۱۱) ''ہندوستان میں ہمارے دو بادشاہ ہیں ایک جارج خامس دوسرے محمد خامس۔ جارج خامس ہماری جان کے مالک ہیں لیکن محمد خامس کا قبضہ دلوں پر ہے اور ہماری دلی تمنا ہے کہ ان دونو تاجداروں کے تعلقات برادرانہ رہیں تاکہ ہماری جانِ حزیں ہمارے دلِ ناشاد سے الجھنے نہ پائے'' زمیندار گولڈن جوبلی نمبر ص۳۷ بحوالہ ظفرعلی خان ادیب شاعر ص۸۴،۸۵

(۱۱۲) اشرف عطا مولانا ظفرعلی خان لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن، ص ۷۱،۷۲

(۱۱۳) چمنستان ص۱۶۲